علماء کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

علماء کا مقام

اور ان کی ذمہ داریاں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرتب

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ - اگست ۲۰۱۲ء

کتاب	:	علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں
مصنف	:	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
ترتیب	:	عبدالہادی اعظمی ندوی
صفحات	:	۱۹۲
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
سیٹنگ	:	سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرس

علمائے ربانی، ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت
(۱۵-۴۳)

علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

(۴۴-۵۲)

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

(۵۳-۶۳)

موجودہ دور کے بے چین ذہنوں کو مطمئن کرنا علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری

(۶۴-۷۳)

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

(۷۴-۸۲)

عہد حاضر کا چیلنج اور علماء کے فرائض

(۸۳-۹۵)

عصر حاضر کا جدید چیلنج اور علماء و اہل مدارس کی ذمہ داریاں
(۹۶-۱۰۴)

پیام راہ
(۱۰۵-۱۱۷)

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری اور ان کی مطلوبہ صفات

(۱۱۸-۱۲۹)

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

(۱۳۰-۱۳۹)

غیرت صدیقی پیدا کیجیے!

(۱۴۰-۱۶۳)

دینی تعلیمی تحریک کا پیغام اور علماء کی ذمہ داریاں
(۱۶۴-۱۷۴)

حاملین علم اور اہل حق کے ساتھ آزمائشیں

(۱۸۳-۱۷۵)

بنگلہ دیش میں اہل علم وفکر کی ذمہ داری بنگلہ زبان میں مہارت وقیادت

(۱۹۰-۱۸۴)

قوم میں علماء کا منصب ومقام اور عوام میں ان کے بے اثر ہونے کے اسباب

(۱۹۲-۱۹۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

''علم'' کے موضوع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تقریروں اور قدیم تحریروں کے جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں، ان میں یہ چوتھا مجموعہ ہے، جو علماء کے مقام اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے، امت مسلمہ کی قیادت کا فریضہ ہمیشہ علماء نے انجام دیا ہے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء پیدا فرمائے ہیں جنھوں نے امت کو خطرات سے نکالا ہے، اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کی کوشش کی ہے، اسلام کی تاریخ ایسے باخدا افراد سے روشن ہے جنھوں نے حالات کو سمجھا ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے کے لیے اور ان کو صحیح رخ پر لانے کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، جو اسلامی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات بھی ان ہی علمائے ربانیین اور مجددین و مصلحین کے طلائی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں اور دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کو رہنما خطوط دیے ہیں، اور پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا ہے، حضرت مولانا کی تحریروں اور تقریروں کا ایک اہم موضوع طبقۂ علماء کو ان کے منصب و مقام سے آگاہ کرنا اور ان کو ان کی ذمہ داریاں دلانا ہے۔

حضرت مولانا نے حالات کی روشنی میں علماء کے لیے ان کے کام کی نوعیت واضح فرمائی ہے، ان کی زندگی کا مقصد اور ان کا مرکز عمل بتایا ہے، اور دعوت الی اللہ اور اشاعت علم دین کی

طرف ان کو خاص طور پر متوجہ کیا ہے، اور اس کے لیے علمائے حق کے صبر و عزیمت اور ثبات و استقامت کی مثالیں پیش فرمائی ہیں، اور عمل کے اعتبار سے بھی ان کو اعلیٰ معیار پر رہنے کی تلقین کی ہے اور ان کو امت کے لیے ''قطب نما'' قرار دیا ہے۔

پیش نظر کتاب میں اسی موضوع پر حضرت مولانا کے مختلف مضامین اور تقریروں کو یکجا کیا گیا ہے، جو مختلف رسائل میں منتشر تھے، تا کہ اس سے استفادہ آسان ہو، اور اس کا فیض عام ہو، عزیز القدر مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی سلمہ شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ اہم کام بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دیا، عزیز القدر مولوی محمد نفیس خاں ندوی اور مولوی محمد مکی حسنی سلہما بھی اس کام میں شریک ہیں کہ انھوں نے طباعت کے مراحل اپنے سر لیے، اللہ تعالیٰ سب کو اجر جزیل عطا فرمائے، اور کتاب کے نفع کو عام فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی

دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

علمائے ربانی
ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت

علمائے حق کی زندگی کا مقصد اور ان کا مرکز سعی وعمل

علمائے حق، حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے وارث وجانشین ہیں "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ"۔[1] ان کی وراثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی جب ان کی زندگی کا مقصد اور ان کی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیائے کرام کا تھا، وہ مقصد زندگی اور وہ مرکز سعی وعمل کیا ہے؟ دو لفظوں میں "دین خالص"، یا ایک لفظ میں "توحید"! یعنی اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اور کامل اطاعت، جو تنہا اسی کا حق ہے، اس کو اپنی ذات سے عمل میں لانا اور دوسروں میں اس کے لیے جدوجہد کرنا، ﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾[سورة الزمر:٣]، ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾[سورة البقرة:١٩٣]۔

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْٓ إِلَيْهِ أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُوْنِ.﴾[سورة الأنبياء:٢٥]

"اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں، پس میری ہی بندگی کرو۔"

﴿هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ.﴾[سورة الصف:٩]

---

(١) أخرجه البخاري في التاريخ الكبير، والترمذي في جامعه، حديث رقم:٢٦٨٢

''وہ ہے جس نے اپنا رسولؐ رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو سب دینوں (تمام قسم کے نظام اطاعت) پر غالب کرے، اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ ناگوار ہو۔''

دینِ حق کے لیے چند موانع

اس دین خالص کے لیے ہر زمانہ میں چند موانع اور مزاحم ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر ان چار اقسام میں داخل ہیں:

شرک

۱۔ شرک: یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنالینا، اللہ کے سوا کسی ہستی کو مافوق الطبعی طور پر ضارّ اور نافع مان لینا، اس کو کائنات میں متصرف اور موثر تسلیم کر لینا۔

احتیاج والتجا (پناہ جوئی) اور خوف ورجا اس عقیدہ کے بالکل قدرتی اور طبعی نتائج و لوازم ہیں، اور دعا واستعانت اور خضوع (جو عبادت کی حقیقت ہے) اس کے لازمی مظاہر ہیں۔

شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے، اس کا اور دین اللہ کا کسی ایک جسم یا دل ودماغ یا خطۂ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے، یہ غیر الٰہی دین جسم ونفس اور جسم ونفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے، جتنی دینِ اللہ کو کم سے کم درکار ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَاداً يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ.﴾ (سورة البقرة:١٦٥)

''بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں، ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔''

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.﴾(سورة الشعراء:٩٧-٩٨)

(مشرکین نے کہا:) خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے، جو تم کو (معبودوں کو)

سارے جہانوں کے پروردگار کے برابر کرتے تھے۔''

اس لیے جب تک زمین سے شرک کی تمام جڑیں اور اس کی باریک سے باریک رگیں بھی اکھاڑ نہ دی جائیں، اس وقت تک دین اللہ کا پودہ لگ نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ پودہ کسی ایسی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا جس کی مٹی میں کسی اور درخت کی کوئی جڑ ہو یا کوئی اور تخم ہو، اس کی شاخیں اسی وقت آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور یہ درخت اسی وقت پھلتا پھولتا ہے جب اس کی جڑ گہری اور مضبوط ہو۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا.﴾ [سورة إبراهيم: ٢٤-٢٥]

''تم نے نہ دیکھا اللہ نے کیسی ایک مثال بیان کی، پاکیزہ بات (کلمۂ طیبہ وغیرہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے، اس کی جڑ مضبوط ہے، اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں، اپنا پھل لاتا ہے ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔''

یہ درخت کسی دوسرے درخت کے سایہ میں بڑھ نہیں سکتا، یہ جہاں رہے گا تنہا رہے گا، اس کے طبعی نشو ونما کے لیے لا متناہی فضا چاہیے۔

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ.﴾ [سورة الزمر: ٣]

''یاد رکھو اللہ ہی کی تنہا تابعداری ہے۔''

پس جو لوگ دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، وہ اس کو کسی جگہ قائم کرنے کے لیے زمین کو پورے طور پر صاف اور ہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں چن چن کر نکا لتے ہیں، اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل اُلٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، اور چاہے ان کی دن رات کی اس کوشش اور عمر بھر کی اس جد و جہد کا حاصل حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرح چند نفوس سے زیادہ نہ ہو، اور چاہے بعض پیغمبروں کی طرح ان کی ساری زندگی کا سرمایہ صرف ایک شخص ہو، لیکن وہ اس نتیجہ پر قانع اور اس کامیابی پر مسرور ہوتے ہیں، اور نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

کفر

۲- کفر یعنی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا انکار، یہ انکار اس کی حکومت سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی ہے، خواہ کسی طریقہ اور علامت سے ظاہر ہو۔

اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ اور رسولؐ کے احکام میں سے کسی حکم کو بھی یہ جان لینے کے بعد کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے نہیں مانتے، یا زبان سے تو انکار نہیں کرتے مگر جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ایسے لوگ خواہ دوسرے احکام کے پابند ہوں اس دائرہ سے خارج نہیں، اللہ تعالیٰ یہودیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ.﴾ [سورۃالبقرۃ:۸۵]

”کیا کتابِ الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو، دوسرے حصہ کو نہیں مانتے، تو اس کی کیا سزا ہے جو تم میں سے یہ کام کرتا ہے سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے، اور قیامت کے دن وہ پہنچائے جائیں سخت سے سخت عذاب میں، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔“

صرف اللہ کی خداوندی اور حاکمیت کے اقرار سے طبعی طور پر خداوندی اور حاکمیت کے تمام دعویداروں کی خداوندی اور حاکمیت کا انکار ہو جاتا ہے، لیکن جو اشخاص خداوندانِ باطل کی خداوندی اور حاکمیت کا صاف صاف انکار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، یا دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس قبلہ کی طرف منہ تو کر لیا ہے لیکن دوسرے قبلوں کی طرف ان سے پیٹھ بھی نہیں کی جاتی، دینِ الٰہی کے مقابلہ میں دنیا میں جو نظامِ حاکمیت قائم اور شریعت الٰہی کے مقابلہ میں جو قوانین نافذ ہیں ان سے منحرف نہیں ہوا جاتا، وہ کبھی کبھی ان پر بھی عمل کر لیتے ہیں، اور بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کر لیتے ہیں، وہ درحقیقت اسلام میں داخل نہیں ہوئے، ایمان باللہ کے لیے ”كُفْر بِالطَّاغُوْتِ“[1] ضروری ہے، اور اللہ نے اس کو ایمان پر مقدم کیا ہے۔

(۱) طاغوت ہر وہ ہستی ہے جس کی خدا کے مقابلہ میں اطاعت مطلق کی جائے......... باقی اگلے صفحہ پر

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى. ﴾
[سورة البقرة:٢٥٦]

''جو سرکش کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا''۔

اس لیے قرآن نے ایسے اشخاص کا دعوائے ایمان تسلیم نہیں کیا جو غیر الٰہی قوانین، ان کے نمائندوں اور ان کے مرکزوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کو اپنا حَکَم اور ثالث بناتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا. ﴾[سورة النساء:٦٠] (٢)

''تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا، چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں سرکش کی طرف، حالانکہ ان کو حکم ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کریں، اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر دور لے جا ڈالے''۔

جاہلیت

اس کفر کی بو، اُن اشخاص سے بھی نہیں نکلی جو مسلمانوں کے دائرے میں آ جانے کے بعد بھی ''جاہلیت'' سے منحرف اور عقائد و رسوم سے بے تعلق نہ ہو سکے، ان کے دلوں سے ابھی تک ان چیزوں کی نفرت اور کراہت نہیں گئی، اور ان کاموں کی تحقیر نہیں نکلی جن کو جاہلیت

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)...... ''اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُتَعَدٍّ وَ كُلِّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (معجم مفردات ألفاظ القرآن للراغب الأصفهاني) خواہ وہ شیطان ہو یا سلطان یا معمولی انسان۔

(۲) یہ آیت حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس منافق کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنے ایک مقدمہ میں (جس کا دوسرا فریق ایک یہودی تھا) مشہور یہودی رئیس اور عالم کعب بن الاشرف کو قاضی اور حَکَم بنایا تھا۔[دیکھیے: تفسیر روح المعانی للآلوسی، تفسیر سورہ نساء، آیت (۶۰)۔

برا سمجھتی ہے، ان سے نفرت اور ان کی تحقیر کرتی ہے، خواہ وہ اللہ کے دین میں پسندیدہ اور مستحب ہوں، اور اللہ کے رسولؐ کی محبوب سنت ہوں۔

اسی طرح ان کے دلوں سے ابھی تک ان اعمال و اخلاق اور رسوم و عادات کی محبت اور عزت دور نہیں ہوئی جو اہلِ جاہلیت کے نزدیک محبوب و معزز ہیں، خواہ وہ اللہ کی شریعت میں مکروہ اور حقیر ہوں۔

اسی طرح جن کے دلوں سے ابھی تک جاہلی حمیت اور عصبیت دور نہیں ہوئی، اور ان کا عمل جاہلیت عرب (اور درحقیقت ہر جاہلیت) کے اس مقبول و مسلّم اصول پر ہے کہ "اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً"، "اپنے بھائی کی ہر حال میں مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم"، اس سے زیادہ نازک بات یہ ہے کہ اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد بھی، یا مسلمان کہلانے کے باوجود بھی حسن و قبح کا معیار وہی ہو جو جاہلیت میں ہوتا ہے، اشیاء کی قیمت وہی ہو جو جاہلیت نے قائم کر دی ہے، زندگی کی اُنہیں قدروں اور اُنہیں معیاروں کی وقعت ہو جو جاہلیت تسلیم کرتی ہے۔

اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ کفر اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات، اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے، اور اس کی طرف واپسی اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو، اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر کے کسی ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو، بخاری کی حدیث ہے:

"ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ، أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ"(۱)

"تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے انسان سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت ہو، تیسرے یہ کہ کفر میں جانا اس کے لیے اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔"

---

(۱) رواه البخاري في صحيحه، حديث رقم: ١٦

صحابۂ کرام کی کیفیت یہی تھی، ان کو اپنے زمانہ سابق (جاہلیت) سے شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی، ان کے نزدیک ''جاہلیت'' سے بڑھ کر کوئی توہین نہ تھی، وہ جب اپنے اسلام لانے سے پہلے کے زمانے کا تذکرہ کرتے تو نہایت شرمندگی اور نفرت کے ساتھ، اس زمانہ کی تمام باتوں، اعمال واخلاق اور کفر وفسق اور اللہ کی نافرمانی سے ان کو نہ صرف شرعی اور عقلی، بلکہ طبعی کراہت تھی، اللہ تعالیٰ ان کی یہ صفت اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ.﴾[سورة الحجرات:۷]

''لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو کُھبا دیا تمہارے دلوں میں، اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ ونافرمانی کی۔''

جاہلیت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اللہ ورسولؐ کا کوئی حکم سنایا جائے تو قدیم رسم ورواج اور باپ دادا کے طور طریق کا نام لیا جائے اور اللہ ورسولؐ کے مقابلہ میں گذشتہ زمانہ اور پرانے دستور کی سند پیش کی جائے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا اَوَلَوْ كَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ.﴾[سورة البقرة:۱۷۰]

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی راستہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی، اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ۔''

﴿بَلْ قَالُوْآ اِنَّا وَجَدْنَآ آبَاءَ نَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى آثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ.﴾ [سورة الزخرف:۲۲]

''بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہیں کے نقش قدم پر ٹھیک چل رہے ہیں۔''

اللہ کے حکم اور وحی کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے عمل اور اپنی خواہش ومرضی کی پیروی کرنا خاص جاہلی دین ہے:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ

اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔﴾[سورۃ ھود:۸۷]

''انہوں نے کہا: اے شعیب! کیا تمہاری نماز نے تم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا ہم چھوڑ دیں جو ہم اپنے مالوں میں اپنی من مانی باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

پس ایسے تمام لوگ جاہلیت سے نکل کر اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے جو اللہ کے مقابلہ میں ہر چیز سے دستبردار نہیں ہوئے، اور جنہوں نے اپنے تئیں مکمل طور پر اللہ کے حوالے نہیں کیا، یہ مکمل دستبرداری اور تسلیم کامل وہ اسلام ہے جس کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا، اور انہوں نے اس کو قبول کیا:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔﴾[سورۃ البقرۃ:۱۳۱]

''جب (ابراہیمؑ سے) ان کے رب نے کہا کہ اپنے رب کے حوالے ہو جاؤ، اور اس کی مکمل تابعداری کرو، انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے تئیں سارے جہان کے پروردگار کے حوالے کر دیا۔''

اور جس کا تمام مسلمانوں کو حکم ہے:

﴿فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا۔﴾[سورۃ الحج:۳۴]

''تمہارا معبود و حاکم ایک ہی معبود و حاکم ہے، پس اسی کے حوالے ہو جاؤ اور مکمل تابعدار بن جاؤ''۔

اگر یہ نہیں ہے تو گویا اللہ سے جنگ ہے، اس لیے اس مکمل اسلام کو ایک جگہ اللہ نے سِلْم کہا ہے، یعنی یہ اللہ سے صلح ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ

---

(۱) مفسرین نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے کہ بعض مسلمانوں کو ایسی چیزوں کے کھانے پینے میں تأمل ہوا جو ان کے قدیم مذہب میں ان کے لیے جائز نہیں تھیں اور جن کے استعمال کے وہ عادی نہ تھے، یہ آیت اگرچہ عام اصول تفسیر کے مطابق کچھ اسی واقعہ سے مخصوص نہیں اور نہایت پر معانی اور جامع آیت ہے جو تمام احکام اسلام پر مشتمل ہے، لیکن اس سے اس پہلو کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾[سورۃ البقرۃ:۲۰۸] (1)

"اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ صلح واسلام میں پورے پورے اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

یاد رہے کہ جاہلیت سے مراد صرف بعثت نبویؐ کے قبل کی عرب کی زندگی ہی نہیں ہے، بلکہ ہر وہ غیر اسلامی زندگی اور نظام ہے جس کا ماخذ وحی ونبوت اور کتاب الٰہی وسنت انبیاء نہ ہو، اور جو اسلام کے مسائل واحکامِ زندگی سے مطابقت نہ رکھتا ہو، خواہ وہ عرب کی جاہلیت ہو، یا ایران کی مزدکیت، یا ہندوستان کی برہمنیت، یا مصر کی فرعونیت، یا ترکوں کی طورانیت، یا موجودہ مغربی تمدن، یا مسلمان قوم کی غیر شرعی زندگی اور ان کے مخالف شریعت رسوم وعادات، اخلاق وآداب اور میلانات وجذبات، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، ماضی ہوں یا حال۔

ایجابی کفر

کفر صرف ایک سلبی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک ایجابی اور مثبت چیز بھی ہے، وہ صرف دین اللہ کے انکار کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مذہبی واخلاقی نظام اور مستقل دین ہے، جس میں اپنے فرائض وواجبات بھی ہیں، اور مکروہات ومحرمات بھی، اس لیے یہ دونوں دین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اور ایک انسان ایک وقت میں ان دونوں کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کی شان

انبیائے کرام کفر کی پوری بیخ کنی کرتے ہیں، وہ کفر کے ساتھ کسی رواداری اور مصالحت کے روادار نہیں ہوتے، کفر کے پہچان لینے کا بھی ان کو بڑا ملکہ ہوتا ہے، اور اس بارے میں ان کی نگاہ بڑی دوررس اور باریک بیں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس بارے میں پوری حکمت اور عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کی خداداد فراست اور بصیرت پر اعتماد کیے بغیر چارہ نہیں، دین کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کفر واسلام کی جو سرحدیں انہوں نے قائم کر دی ہیں، اور ان کے جو نشانات مقرر کر دیے ہیں، ان کی حفاظت کی جائے، اس میں ادنیٰ تساہل اور رواداری

دین کو اتنا مسخ کر کے رکھ دیتی ہے جتنا یہودی، عیسائی اور ہندوستان کے مذہب مسخ ہو گئے۔

وارثین انبیاء کا طور طریق

انبیاء کے صحیح جانشین بھی اس بارے میں انہیں کی فراست اور عزیمت رکھتے ہیں، وہ کفر کا ایک ایک نشان مٹاتے ہیں اور جاہلیت کا ایک ایک داغ دھوتے ہیں، کفر کا ادراک کرنے میں ان کی حس عوام سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، کفر جس لباس میں اور جس صورت میں ظاہر ہو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں، اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں، کہیں ہندوستان جیسے ملک میں بیواؤں کے نکاح ثانی کو حرام سمجھنے اور اس سے شدید نفرت رکھنے میں ان کو کفر کی بو محسوس ہوتی ہے، اور وہ اس کو رواج دینے اور اس سنت کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں، کہیں قانون شریعت پر رواج کو ترجیح دینا اور بہنوں کو میراث نہ دینے پر اصرار کرنا ان کو کفر معلوم ہوتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کی مخالفت اور ان کا مقاطعہ فرض سمجھتے ہیں، کبھی اللہ و رسولؐ کا صاف و صریح حکم سن لینے کے بعد اس کو نہ ماننا اور غیر الٰہی عدالت اور غیر الٰہی قانون کے دامن میں پناہ لینا اور غیر اسلامی احکام وقوانین نافذ کرنا اُن کو اسلام سے خروج کے مرادف معلوم ہوتا ہے، اور وہ مجبوری کی حالت میں وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں، کبھی کسی نومسلم کے یا ایسے مسلمانوں کے جو غیر مسلموں کی صحبت میں رہتے ہوں اور ان سے متاثر ہوں، ایسا ذبیحہ استعمال کرنے سے احتراز کرنے میں اور اس سے نفرت کرنے میں جس سے ان کی ہمسایہ قوم اور ابنائے وطن سختی سے مجتنب رہتے ہیں، اور ان میں اس کی نفرت یا اس سے وحشت عام ہے، ان کو ایمان کی کمزوری، اور ان کے قدیم مذہب یا غیر مسلموں کی صحبت کا اثر نظر آتا ہے، کبھی بعض حالات و مقامات میں ایک سنت یا فعل جائز و مستحب کو وہ واجب اور شعار اسلامی سمجھنے لگتے ہیں، کبھی وہ غیر مسلموں کے رسوم و عادات اور ان کی تہذیب اور وضع ولباس اختیار کرنے اور ان سے تشبہ پیدا کرنے کی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں، اور کبھی ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔

غرض جاہلیت کی محبت یا اس کی اعانت جس لباس اور جس صورت میں جلوہ گر ہو، اور اس کی روح جس قالب میں بھی ظاہر ہو، وہ اس کو فوراً بھانپ لیتے ہیں، ان کو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اس کی مخالفت کرنے میں کوئی مصلحت ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی، وہ جاہلیت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت رامی شناسم

ان کے زمانہ کے کوتاہ نظر یا رند مشرب وصلح کل جو دیر وحرم، کعبہ و بت خانہ میں فرق کرنا ہی کفر سمجھتے ہیں، ان کی تضحیک کرتے ہیں اور تحقیر کے ساتھ ان کو فقیہ شہر، محتسب، واعظ تنگ نظر اور ''خدائی فوجدار'' کا لقب دیتے ہیں، لیکن وہ اپنا کام پورے اطمینان واستقلال کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبروں کے دین کی حفاظت ہر زمانے میں انہیں لوگوں نے کی ہے، اور آج اسلام یہودیت وعیسائیت اور برہمنیت سے ممتاز شکل میں جو نظر آتا ہے، وہ انہیں کی ہمت واستقامت اور تفقہ کا نتیجہ ہے۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِ الْإِسْلَامِ وَرَنَبِيِّهِ وَنَبِيِّهِ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔ ان کو زبان حال وقال سے یہ کہنے کا حق ہے:

آ غشتہ ایم ہر سرخارے بخونِ دل
قانون باغبا نئے صحرا نوشتہ ایم

بدعت

۳- بدعت: کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ ورسولؐ نے دین میں شامل نہیں کیا ہے، اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا اور اس کا ایک جزو بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لیے کرنا اور اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کیے ہوئے شرائط وآداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے، بدعت ہے۔

شرک وکفر (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے) اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اور شرک وکفر اگر اسلام کے مقابلہ میں خارج کی چیزیں ہیں، تو بدعت دین الٰہی کے اندر

شریعت انسانی کی تشکیل ہے جو اندر اندر نشو ونما پاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشو ونما پانے کا موقع دیا جائے) اصل شریعت سے دو چند وسہ چند ہو جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ شریعت الٰہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے، اس شریعت کی فقہ الگ ہے، اس کے فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات مستقل ہیں، اور بعض اوقات تعداد میں شریعت الٰہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہے، کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا، اس کی پابندی ضروری قرار دینا، یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہے، انسانی قانون سازی اسی منصب الٰہی کے خلاف بغاوت ہے، اسی لیے قانون ساز انسان کو قرآن "طاغوت" کہتا ہے:

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ.﴾[سورة النساء: ٦٠]

"چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس سے اعتقاد نہ رکھیں"۔

لیکن کسی چیز کو دین وشرع قرار دینا اور اس کو کسی خاص شکل اور شرائط کے ساتھ قربت خداوندی اور اجر وثواب کا ذریعہ قرار دینا تو اس سے بھی بڑھ کر بات ہے، یہ تو شریعت سازی ہوئی، اور قرآن کہتا ہے کہ دین وشرع قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ﴾[سورة الشورى: ١٣]

"تمہارے لیے دین کی وہی راہ مقرر کی جس کا (حضرت) نوحؑ کو حکم دیا تھا، اور ہم نے آپ کی طرف حکم بھیجا۔"

اہلِ عرب نے جب اپنی طرف سے تحلیل وتحریم کا کام شروع کیا اور مستقل احکام جاری کیے تو قرآن نے ان پر یہی جرح کی:

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ﴾[سورة

الشوریٰ:۲۱]

''کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین بنایا جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا تھا۔''

یہ اللہ کی اجازت کے بغیر دینی قانون سازی کیا تھی؟ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

﴿وَقَالُوا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ.﴾[سورة الأنعام:۱۳۸]

''اور انہوں نے کہا کہ یہ مویشی اور کھیتی ممنوع ہے، اس کو صرف وہی کھائیں گے جن کو ہم چاہیں، اپنے خیال کے مطابق، اور یہ مویشی ہیں جن کی پیٹھ پر چڑھنا منع ہے، اور کچھ مویشی جن کے ذبح پر اللہ کا نام نہیں لیتے، اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے اس جھوٹ کی ان کو سزا دے گا۔''

﴿وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ.﴾ [سورة الأنعام:۱۳۹]

''اور انہوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے جو کچھ پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں ہی کے کھانے کے لیے مخصوص ہے، اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے، اور اگر مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں، اللہ ان کو ایسی باتیں بنانے کی سزا دے گا، وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔''

عرب کے ان شریعت سازوں کا یہ جرم جس کو قرآن ''افترا'' کہتا ہے، کیا تھا؟ یہی کہ انہوں نے بلا کسی آسمانی سند اور وحی کے محض اپنے اتفاق رائے اور اصطلاح سے ایک چیز کو ایک کے لیے حلال اور دوسرے کے لیے حرام کر دیا، اور اس کے ایسے قواعد و احکام اور اصول و ضوابط مقرر کیے جن کا کوئی آسمانی ماخذ نہ تھا، اور پھر ان کی ایسی پابندی کی اور دوسروں سے کرائی جیسی پیغمبروں کی شریعتوں اور احکام الٰہی کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو سخت گنہگار سمجھا جائے اور ملزم اور مطعون ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی جرم قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾[سورة التوبة: ٣١]

''انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کر خدا ٹھیرالیا۔''

آنحضرت (ﷺ) نے عدی بن حاتم کے سامنے اس آیت کی یہی تفسیر کی کہ عیسائی علماء ومشائخ نے جس چیز کو ان کے لیے حلال یا حرام قرار دے دیا، انہوں نے بے چون وچرا اس کو مان لیا اور ان کو مستقل شارع قرار دے دیا۔(۱)

درحقیقت تحلیل وتحریم میں اور کسی چیز کو بلا دلیل شرعی فرض وواجب قرار دینے اور کسی خاص شکل اور آداب وشرائط کے ساتھ کار ثواب اور ذریعۂ تقرب الی اللہ قرار دینے میں کوئی اصولی فرق نہیں، دونوں ''شَرْعُ مَالَمْ يَأذَنْ بِهِ اللّٰه'' کے حکم میں آتے ہیں۔

دین مکمل ہو چکا

بدعت دوسری جس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے، یہ ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی ہے، جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا، ایک انسان کی نجات کے لیے جتنے اعمال ضروری ہیں اور تقرب الی اللہ کے لیے جتنے وسائل تھے، ان سب کی وضاحت کر دی گئی اور دین کی ٹکسال بند کر دی گئی، اب جو نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً﴾[سورة المائدة:٣]

''میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لیے پسند کیا۔''

تکمیل نعمت کے یہ خلاف ہے کہ دین وشریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور غیر متعین چھوڑ دیا جائے، اور صدیوں تک مسلمان اس کے دریافت سے غافل اور اس کے ثواب سے محروم رہیں، خصوصاً خیر القرون کے وہ لوگ جو ﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ کے مخاطب اول

(۱) أخرجه الترمذي في أبواب التفسير، حديث رقم ٣٠٩٥

تھے، اور پھر صدیوں کے بعد اس کا انکشاف اور تعین ہو۔

اس شریعت میں جو شخص بھی کوئی نیا اضافہ کرتا ہے اور کسی خارج از دین بات کو دین کا جزو قرار دیتا ہے، کسی ایسی چیز کا اہتمام کرتا ہے جس کا اللہ کے رسولؐ نے اہتمام نہیں کیا، یا تقرب الی اللہ کے کسی نئے ذریعہ کا انکشاف کرتا ہے، وہ گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ دین میں یہ کمی رہ گئی تھی، اس کو اب پورا کیا جا رہا ہے، اور یہ آنحضرت (ﷺ) کی تبلیغ رسالت پر بڑا الزام ہے، جن کو حکم تھا کہ:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾[سورة المائدة:٦٧]

''اے پیغمبر! پہنچا دو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا، اور اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔''

امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا:

''مَنِ ابْتَدَعَ فِي الْإِسْلَامِ بِدْعَةً، يَرَاهَا حَسَنَةً، فَقَدْ زَعَمَ أَنَّ مُحَمَّداً (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) خَانَ الرِّسَالَةَ، فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ "اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" فَمَالَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِيْنًا فَلَا يَكُوْنُ الْيَوْمَ دِيْنًا''۔ (۱)

''جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی، اس لیے کہ اللہ فرماتا ہے کہ ''میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا''، پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔''

شریعت محمدی ایک عالم گیر اور ابدی قانون

شریعت منزّل من اللہ کی ایک خصوصیت اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لیے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے، اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہے، اس کو انسانوں کی فطری کمزوری، ان کے مصالح

(۱) الاعتصام للشاطبي، الباب الثاني في ذم البدع و سوء منقلب أصحابها.

اور ان کے مختلف و متفاوت حالات کا پورا علم ہے، اس کے ساتھ وہ رؤوف و رحیم (بے حد مہربان اور شفیق) بھی ہے، اس علم محیط اور شفقت بے پایاں کی بنا پر اس نے انسانوں کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے نہایت آسان شریعت نازل کی، احکام شریعت میں ان کی کمزوریوں، مشکلات اور کوتاہیوں کا پورا لحاظ رکھا، اور ان کی قوت، وقت اور وسعت اور زمان و مکان کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ان کے لیے ایک عالم گیر اور ابدی قانون مقرر فرمایا، اس کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا.﴾[سورة البقرة:٢٨٦]

''اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا''۔

﴿يُرِيْدُاللّٰه اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفاً.﴾[سورةالنساء:٢٨]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بار کو ہلکا کرنے، اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ.﴾[سورة الحج:٧٨]

''تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی''۔

رسول اللہ (ﷺ) کے متعلق فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.﴾[سورة التوبة:١٢٨]

''تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف شاق ہے، تمہاری اس کو بڑی فکر ہے، ایمان والوں پر نہایت شفیق و مہربان ہے''۔

رسول اللہ (ﷺ) نے اپنی شریعت کے متعلق فرمایا:

''بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ.''(۱)

''مجھے نہایت سیدھے سادے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا''۔

''إِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ''(۲)

''بے شک یہ دین آسان ہے''۔

(۱)رواه أحمد في مسنده عن أبي أمامة الباهلي، حديث رقم:٢٢٦٤٧

(۲)رواه النسائي في السنن الكبرى، كتاب الإيمان و شرائعه، الدين يسر، حديث رقم:١١٧٦٥

امت کی مشقت کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ فرمایا:

"لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ." (۱)

"اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا فرض قرار دے دیتا۔"

لیکن دین کی یہ سہولت اور خدا کی طرف سے اس بات کی ضمانت اسی وقت تک ہے جب تک کہ اللہ شارع ہے اور شریعت اسی کی ہے، لیکن جب انسان شارع بن جائے اور وہ شریعت الٰہی میں مداخلت اور اضافہ شروع کر دے، تو پھر دین کی سہولت باقی نہیں رہ سکتی، نہ انسان کا علم محیط ہے، نہ وہ مختلف انسانوں کی ضروریات، مصالح اور زمان ومکان کے اختلافات کا لحاظ رکھ سکتا ہے، نہ اس کو اپنے بنی نوع پر وہ شفقت ہوسکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو دین خالص ہونے کی صورت میں ہر ایک کے لیے قابل عمل اور بالکل سہل ہوتا ہے، وہ ان بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد اس قدر دشوار، پیچدار اور طویل ہو جاتا ہے کہ اس پر پورے طور پر عمل کرنا رفتہ رفتہ ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے، لوگوں کو گریز اور حیلہ جوئیوں کی عادت پڑ جاتی ہے، اور بہت سے لوگ ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں، مذاہب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترک مذہب کی بکثرت نوبت اور الحاد ولا مذہبیت کا آغاز عموماً انہیں لامتناہی بدعات کے بعد ہوا، جن کی پابندی ایک متوسط درجہ کے انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہوگئی تھی، اور آدمی ان کا پابند رہ کر کسی اور کام کا نہیں رہ سکتا تھا، قرون وسطی میں بھی علم وعقل کی بغاوت کلیسا کے اسی مذہبی نظام کے خلاف تھی جس سے اصل مسیحی مذہب کو ۱/۱۰ کی نسبت بھی نہ تھی۔

یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ الٰہی دین وشریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالم گیر یکسانی ہے، یہ یکسانی زمانوں کے لحاظ سے بھی ہے اور مکانوں کے لحاظ سے بھی، اللہ چونکہ "رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ" ہے، وہ زمان ومکان کے حدود وقیود سے بالاتر ہے، اس لیے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے، اس کی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ

(۱) رواه أبو داود في سننه، كتاب الطهارة، باب السواك، حديث رقم:٤٧

(ﷺ) پر ہو چکی ہے، آفتاب کی طرح سب کے لیے ایک اور زمین و آسمان کی طرح سب کے لیے یکساں ہے، اس کی شکل جو قرنِ اول میں تھی وہی شکل چودھویں صدی ہجری میں بھی ہے، وہ جیسی اور جتنی مشرق والوں کے لیے ہے، ویسی ہی اور اتنی ہی مغرب والوں کے لیے بھی، جو قواعد و احکام، عبادت کے جو اشکال اور تقرب الی اللہ کی جو متعین شکلیں اہلِ عرب کے لیے تھیں وہی اہلِ ہندوستان کے لیے بھی، اسی لیے اگر دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو فرائض اسلام کے ادا کرنے میں اور مسجد میں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، نہ اس کے لیے کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبری کی ضرورت ہوگی، اس کو دینی حیثیت سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی، علاوہ مقتدی ہونے کے وہ اگر صاحب علم ہے تو ہر جگہ امام بن سکتا ہے اور ہر جگہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

بدعات یکساں نہیں ہوتیں

لیکن بدعات کا یہ خاصہ نہیں، ان میں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی، ان میں زمان و مکان کا پرتَو ہوتا ہے، وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں، اور خاص تاریخی و مقامی اسباب اور ماحول میں بنتی ہیں، ان کو تمام عالم اسلامی میں رواج نہیں دیا جاسکتا، نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے، علم ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو قبول کرلیں، اس لیے ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں، اور ایران و شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں، ملکوں سے گزر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں، ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا، یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور گھروں تک پہنچ سکتی ہے، اور گھر گھر کا دین مختلف ہوسکتا ہے۔

رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے تمام دوسری شریعتوں اور مذاہب کا عبرتناک انجام تھا، یہودیت اور عیسائیت مسخ شدہ اور محرف شکل میں موجود تھیں، اس لیے آپ نے شریعت اسلامی کو اپنی حقیقی شکل اور اصلی مقدار میں رکھنے کی پوری کوشش فرمائی اور اس کے لیے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں، آپ نے اپنے جانشینوں کو بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی

بڑی تاکید سے تلقین کی، آپ نے فرمایا:

"مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ." (۱)

"جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی، تو وہ بات مسترد ہے۔"

"شَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَ كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ." (۲)

"بدترین بات (دین میں) نئی باتیں ایجاد کرنا ہے، اور (دین میں) ہر نئی ایجاد کردہ چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔"

اور یہ حکیمانہ پیش گوئی بھی فرمائی:

"مَاأَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلَّارُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ." (۳)

"جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت اٹھ جاتی ہے۔"

صحابہ کا طرزِ عمل

آپ کے براہِ راست جانشین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس وصیت کی پوری تعمیل کی اور بدعات کے بارے میں کسی قسم کی رواداری اور کمزوری روا نہیں رکھی، ان کے انکارِ بدعات کے واقعات ملاحظہ ہوں، اگر کوئی شخص بدعات کے حقیقی مفاسد اور محافظت شریعت کی حکمت واسرار سے واقف نہ ہو، تو ان کو تشدد اور غلو پر محمول کرے گا، لیکن اگر کوئی شخص مذاہب کی تاریخ

(۱) رواه ابن ماجه في سننه، كتاب السنة، باب تعظيم حديث رسول الله (ﷺ) و التغليظ على من عارضه، حديث رقم: ۱۴

(۲) رواه ابن خريمة في صحيحه، حديث رقم: ۱۷۸۵.

(۳) أخرجه أحمد في مسنده عن غضيف بن الحارث، حديث رقم: ۱۷۰۹۵۔ اس فرمان نبویؐ کی اگر شرح دیکھنا ہو تو مکتوبات امام ربانیؒ (مکتوب ۸۶ بہ خواجہ عبدالرحمٰن، ص: ۱۸۶ و ۸۷) احمدی و ص: ۲۵۵ ملا طاہر لاہوری میں ملاحظہ ہو، یا ان لوگوں کی عملی زندگی میں جو بدعات میں مبتلا ہیں۔

سے واقف ہے، تو وہ ان حضرات کے تفقہ اور حکمت دین کی داد دے گا کہ اگر دوسری ہی نسل میں مذہب کی شکل کی حفاظت نہ کی جاتی تو وہ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

علمائے حق بدعات کے خلاف کیوں؟

صحابہ کرام کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام نے اعلیٰ درجہ کے فہم دین اور ایسی عزیمت واستقامت کا ثبوت دیا جو انبیائے کرام کے جانشینوں کے شایانِ شان ہے، انہوں نے ہمیشہ اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی، مبتدعین کا علمی وعملی مقاطعہ کیا، اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول اور ان کے علمبرداروں کو وقیع اور باوقار بننے سے روکنے کی کوشش کی، اور ان کو اہل علم کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے گرادیا۔

بالخصوص فقہائے حنفیہ نے جو شدید احتساب کیا، اور جس باریک بینی اور نکتہ فہمی کے ساتھ اپنے زمانہ کے بعض بظاہر معمولی مبتدعانہ اعمال ورسوم کی مخالفت کی، اور شریعت کی حفاظت اور سنت وبدعات کے امتیاز کے لیے جو حکیمانہ انتظامات اور فقہی احتیاطیں کیں، وہ ان کی اصول دین سے گہری واقفیت اور ان کے تفقہ کی بہترین مثالیں ہیں۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ بدعات، عوام اور خوش عقیدہ شائقین دین کے لیے کیسی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں اور کس سرعت کے ساتھ رواج ومقبولیت حاصل کرلیتی ہیں، وہ ان علمائے اسلام کی ہمت ودلیری اور کامیابی کی داد دیں گے، جن کی کوششوں اور اظہار حق سے بعض بعض بدعات کا بالکل سد باب ہوگیا، اور اب ان کا فقہ کی بعض کتابوں یا تمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بعض بدعات جو باقی رہ گئیں، ان کا بدعت ہونا بھی مشتبہ نہیں رہا، اور ایک جماعت ہمیشہ ان کی مخالفت کرتی رہی اور اب بھی کرتی ہے۔

ان مخالفین بدعت اور حاملین لوائے سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کالعوام سے اسی طرح جامد اور روایت پرست وغیرہ کے خطابات ملے، جس طرح ہر زمانہ کے مذاق عام اور رواج عام کے خلاف کہنے والوں اور کرنے والوں کو ملا کرتے ہیں ﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ

قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ﴾[سورة فصلت:٤٣]

غفلت

(۴) غفلت: دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے۔ اللہ سے بے تعلقی اوراس کے احکام وفرائض کی طرف سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت وکفر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے۔ عزت وجاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سرتاپا انہماک آدمی کو معاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے، مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ سرے سے نجات کا خیال، رضائے الٰہی کے حصول کا شوق، اوراس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے، اور کھانے پینے اور پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی۔ خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہوجاتی ہے، نیک وبد اور حلال وحرام کی تمیز جاتی رہتی ہے۔ ایسے غافل اپنے اخلاق واعمال، سیرت وکردار، معاشرت وآداب اور وضع وصورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے، شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات ومحرمات کا آزادی سے ارتکاب کیا جاتا ہے، جرائم اور فسق وفجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں، اوران میں ایسی ذہانت اور ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہوجاتی ہیں، شرع ودین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسی خدا فراموشی اور خود فراموشی طاری ہوجاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا، اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾[سورة الحشر:١٩]

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا۔''

یہی وہ لوگ ہیں جن کا حال اللہ نے اس آیت میں بیان کیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُوْنَ.﴾[سورة يونس:٧]

''بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر مگن اور مطمئن

ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔"

نتیجۃً وعملاً ایسے غفلت شعار اور آخرت فراموش، منکرین آخرت اور اللہ ورسولؐ سے بغاوت کرنے والوں سے ممتاز نہیں ہوتے، پیغمبروں کی دعوت کے لیے ان کا وجود بھی اسی قدر بے سود اور بعض اوقات سنگ راہ ہوتا ہے جس طرح مکذبین ومنکرین کا، اور بعض اوقات یہ مدعیانِ اسلام، اسلام کے خلاف حجت اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، پھر اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ غافلین یا منافقین اپنی کثرت یا دنیاوی لیاقت یا کوششوں یا محض وراثت سے مسلمانوں کی مسند حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں، اور مسلمانوں کی 'امامت' ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے، یا مسلمانوں کی زندگی میں اتنا رسوخ اور اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق واعمال عوام کے لیے نمونہ بن جاتے ہیں، اور ان کی عظمت اور وقعت دل ودماغ میں جاگزیں ہو جاتی ہے، اس وقت ان "اکابر مجرمین" کی وجہ سے غفلت وخدا فراموشی اور غیر اسلامی زندگی کا ایسا دور دورہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں 'جاہلیت' کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات جب اس طرز زندگی کو کچھ زیادہ مدت گزر جاتی ہے تو اسی کا نام "اسلامی تہذیب وتمدن" پڑ جاتا ہے، جس کی مخالفت "غیر اسلامی تمدن" سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

علمائے حق کی ذمہ داریاں وفرائض

ان تمام حالات میں پیغمبروں کے جانشینوں کو کام کرنا پڑتا ہے، شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول اور فرائض وذمہ داریوں سے اتنی گراں بار نہیں، جتنی نائبان رسولؐ اور علماء ومصلحین اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کے طبیبوں کو بھی کبھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آجاتا ہوگا، لیکن ان اطباء روح کے لیے کوئی موسم اعتدال اور صحت کا نہیں، بہت سی جماعتیں ایسی ہیں کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو ان کی جد وجہد ختم ہو جاتی ہے، اور ان کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن علمائے حق اور ﴿قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ [سورۃ المائدۃ:۸] (اللہ کی طرف سے منتظم اور انصاف کے گواہ) کی جماعت کا

کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے، کچھ چیزیں ہیں جو حکومت وطاقت اور دولت وفراغت ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی ہیں، اور علمائے اسلام ہی کا فرض بنتا ہے کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضۂ احتساب ،نگرانی، اخلاق اور دینی رہنمائی کے منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے، اس وقت بھی ان کا جہاد اور اس کی جدوجہد جاری رہتی ہے، کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں، کہیں سامان عیش وغفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے، کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے اور اس کو انڈیل رہے ہیں، کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں، کہیں مردوں کے لیے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بہ جبیں ہیں، کہیں بے حجابی اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں، کہیں حماموں کی بے قاعدگیوں اور بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں، کہیں اپنے زمانہ کے خلاف اخلاق اور خلاف شرع باتوں اور عادتوں کے خلاف وعظ کہہ رہے ہیں، کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کے عادات وخصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے، کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں، اور قَالَ اللّٰہ اور قَالَ الرَّسُوْلُ کی صدا بلند کر رہے ہیں، کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں، اللہ کی محبت وطاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں، امراض قلب، حسد، تکبر، حرصِ دنیا اور دوسرے نفسانی اور روحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں، کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں، اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لیے آمادہ کر رہے ہیں، پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علماء جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے، یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، انہیں مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے، اور مسلمانوں کا کوئی دورِ حکومت ان علمائے حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔

حضرت حسن بصریؒ کی مجلس وعظ

بنی امیہ کا دور مسلمانوں کا شاہانہ عہد ہے، بظاہر مسلمانوں کو تمام کاموں سے فرصت

ہوگئی ہے، مگر علماء کو فرصت نہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مجلسِ وعظ گرم ہے، جس میں اپنے زمانہ کے منکرات وبدعات کے خلاف تقریر ہورہی ہے، اپنے زمانہ کی معاشرت، نظام اور اہلِ حکومت کی بے دینی پر تنقید ہے، نفاق کی علامات اور منافقین کے اوصاف وسیع پیرایہ میں بیان ہورہے ہیں، اور موجودہ زندگی پر ان کو منطبق کیا جارہا ہے، خشیت الٰہی اور آخرت کا بیان ہے جس سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئی ہیں، اور روتے روتے حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں، سورہ فرقان کے آخری رکوع ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [سورة الفرقان: ٦٣] کی تفسیر ہورہی ہے، (۱) اور صحابہ کرامؓ کے چشم دید حالات اور واقعات اس طرح بیان کیے جارہے ہیں کہ اس مبارک دور کی تصویر کھنچ گئی ہے اور صحابہؓ چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں، لوگ مجلس سے توبہ کرکے اٹھتے ہیں، اور سیکڑوں آدمیوں کی اصلاح حال ہورہی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا اعلان حق

بنی عباس کا دور ہے اور امام احمد بن حنبلؒ، شاہِ وقت کے ذوق ورجحان اور مسلک کے خلاف مذہبِ اعتزال کی صاف صاف تردید کررہے ہیں، اور بدعات کا ردّ اور سنت کا اعلان کرتے ہیں، علم کلام اور فلسفہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے مقابلہ میں خالص سنت اور عقائد سلف کی تبلیغ فرمارہے ہیں، اور یہ سب اس جرأت اور اطمینان کے ساتھ کہ گویا مامون ومعتصم کی حکومت نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت ہے۔

علامہ ابن الجوزیؒ کے مواعظ

بغداد اپنے اَوج پر اور بغداد کی تہذیب، دولت اور بے فکری اور آزادی عروج پر ہے، ہر طرف عیش وغفلت کا سمندر رواں ہے، کرخ ورصافہ کے میدانوں میں اور مسجدوں کے سامنے میلے لگے ہوئے ہیں، بازاروں میں بڑی چہل پہل ہے، لیکن سیکڑوں آدمی ان تمام

(۱) کتاب قیام اللیل، محمد بن نصر مروزی

دلچسپیوں اور تفریحات سے آنکھ بند کیے ایک طرف چلے جا رہے ہیں، آج جمعہ کا دن ہے، محدث ابن جوزیؒ کا وعظ ہو رہا ہے، سیکڑوں آدمی تائب اور بیسیوں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں، لوگ خلاف شرع امور سے توبہ کر رہے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا روحانی فیض

ایک طرف اسی پرشور اور ہنگامہ زدہ بغداد میں نہایت سکون واطمینان کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس، وعظ اور روحانی فیض جاری ہے، جس سے عرب وعجم کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے امراء اور شاہزادے اپنے عیش ودولت کو خیرباد کہہ کر زہد وفقر کی زندگی اختیار کرتے ہیں، بڑے بڑے سرکش اور نشۂ دولت میں مخمور تائب ہوتے ہیں، خلافت عباسی کے عین دارالخلافۃ میں اور خلیفۂ بغداد کی حکومت کے بالکل مقابل اس درویش کی روحانی اور دینی حکومت قائم ہے، جس کا سکہ عرب وعجم پر رواں ہے۔

دیگر مساعی اور کوششیں

بعد کے تمام عہدوں میں اور حکومت اسلامی کے تمام اطراف واکناف میں، سلاطین وامراء کے بالمقابل اور تمام دوسری دلچسپیوں، دعوتوں اور تحریکوں اور مشاغل کے ساتھ علمائے حق کی یہ کوششیں اور ان کے مرکز، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مجالس وعظ اور باضابطہ و بے ضابطہ احتساب جاری رہا۔(۱)

علمائے حق کا صبر وعزیمت اور ثبات واستقامت

علمائے حق کا یہی بدقسمت یا خوش قسمت گروہ ہے جس کو مسلمان بادشاہوں اور ان کے کارکنان حکومت کے ہاتھوں (جب کہ دوسروں کو سیم وزر کی تھیلیاں اور عہدوں کے پروانے

(۱) ہندوستان کے لیے اس کی تفصیل سب سے زیادہ والد مرحوم مولانا سید عبدالحیؒ کی عظیم الشان عربی تصنیف 'نزہۃ الخواطر' کی آٹھ جلدوں میں ملے گی جو ہندوستان کے مسلمان مشاہیر واعیان اور علماء کی سب سے بڑی تاریخ ہے۔

ملتے تھے) دار ورسن اور تازیانے کے انعامات ملے، اسی گروہ کے کتنے افراد کو ایک مسلمان حاکم (حجاج) کے ہاتھوں شہادت کا سرخ خلعت ملا، پھر اسی گروہ کے ایک مقتدر فرد (حضرت امام ابوحنیفہؒ) کو امیر المؤمنین منصور عباسی کے ہاتھوں زہر کا جام نوش کرنا پڑا، پھر اسی گروہ کے دوسرے امام (حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کو سب سے بڑے روشن خیال مسلمان بادشاہ (مامون) کے زمانہ میں پابجولاں اور اسیر زنداں ہونا پڑا، اور اس کے جانشین (معتصم) کے ہاتھوں تازیانے کھانے پڑے۔

آخر زمانے میں بھی کیسے کیسے عادل وداد گر مسلمان فرمانرواؤں کے ہاتھوں کیسے کیسے جلیل القدر علماء پر بیداد ہوئی، جہانگیر کی زنجیر عدل مشہور ہے، مگر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے پاؤں میں بھی زنجیر پڑی اور ان کو اپنے اظہارِ حق کے صلہ میں گوالیار کے قلعہ میں محبوس ہونا پڑا۔

دعوت وجہاد

ان کارناموں اور خدمات کے علاوہ (جو حاملین دین اور محافظینِ شریعت کے فرائض منصبی ہیں) جن کو ہم اس حیثیت سے دفاعی کہہ سکتے ہیں کہ وہ شرک وکفر، بدعت اور غفلت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی کوششیں ہیں، مگر یہ درحقیقت اسلام کی مستقل دعوت وتبلیغ اور دین کی مسلسل جدوجہد ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

"لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ." (۱)

"میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر علانیہ قائم رہے گا، کسی کے مدد نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔"

"اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلىٰ أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ، لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ، وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ." (۲)

---

(۱) رواه مسلم، حديث رقم: ٤٩٥٠

(۲) رواه أبو يعلى الموصلي في مسنده عن أنس بن مالك، (رقم: ٤٢٩٦) و الديلمي ١٢٢/٢، (رقم: ٢٦٣٩)۔

''جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا، اور میرے آخری امتی کے دجال سے جنگ کرنے تک جاری رہے گا، اسے نہ تو کسی ظالم کا ظلم ختم کرے گا اور نہ ہی کسی عادل کا عدل۔''

ارتداد اور اس کا مقابلہ

لیکن ان کے علاوہ دو اور خدمتیں ہیں جو ہر زمانہ کے علماء کے ذمہ ہیں اور علمائے ربانی ان کو انجام دیتے رہے ہیں:

۱- اسلامی فتوحات سے کم تر، اور مبلغین، صلحاء وصوفیہ اور بعض مسلمانوں کے اخلاق اور محبت کے اثر سے بیشتر مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا، اور پوری پوری برادریاں اور بڑے بڑے خاندان اسلام میں داخل ہو گئے، لیکن ان کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکا، اور ان پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ پڑ سکا، یا اگر ان پر کوئی اثر پڑا تو ان کی بعد کی نسلوں میں یہ اثر باقی نہ رہ سکا، اور رفتہ رفتہ اس کے سوا ان کو کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے، اور اُنہوں نے کسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور سوائے اسلامی نام اور کلمۂ طیبہ کے الفاظ کے ان کے پاس اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کچھ دنوں کی اور بے توجہی کے بعد اسلامی نام بھی باقی نہ رہے، اور کلمۂ طیبہ بھی سیکڑوں میں سے چند کے سوا کسی کو یاد نہ رہا، مگر اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف باقی رہا، پھر وہ بھی مٹنے لگا، اور اس وقت باقاعدہ ان کا ارتداد عمل میں آنے لگا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں خاص حلقہ کے باہر اسلام کی بنیاد ہمیشہ کمزور رہی، اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، تقریباً ہر بڑے شہر سے فاصلہ پر اور ہندوستان کے تمام اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی مسلمان قومیں اور برادریاں موجود ہیں جن کو اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا، دیہاتوں کی بڑی مسلمان آبادی ایسی ہے جو نئے سرے سے تبلیغ اسلام کی محتاج ہے، ان میں سے بکثرت ایسے ''مسلمان'' ہیں جو ہنوز عہدِ جاہلیت میں ہیں، اور ان کو بعثت نبوی کی خبر نہیں، وہ اسلام سے اتنے بے خبر ہیں جتنے دیہاتوں کے غیر مسلم، فرائض واحکام

اسلام کا ذکر چھوڑ کر بعض بڑے شہروں کے اطراف ونواح میں ایسے مسلمان ملتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نامی سے بھی واقف نہیں۔

بعض علمائے ربانی نے اپنے زمانہ میں ان علاقوں اور دیہاتی رقبوں کی طرف توجہ کی ،اور بعض مسلمان قوموں اور برادریوں کو از سرِ نو مسلمان بنایا، ان میں تبلیغی دورے کیے، وعظ ونصیحت، اختلاط، آمد ورفت اور اپنے اخلاق وتالیف قلب سے ان کے دل مٹھی میں لیے، ان کو مرید کر کے ان کو توحید اور اتباع سنت کے راستہ پر لگایا، شرک وبدعت سے تائب کیا، جاہلانہ رسمیں، غیر مسلموں کی وضع وصورت اور کفر وجاہلیت کے شعار چھڑائے، ان میں اخلاق وانسانیت پیدا کی، پابند فرائض اور خوش اوقات بنایا، علم کا شوق دلایا اور تعلیم کو رائج کیا، اور ان میں سے لائق افراد کو چھانٹ کر اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت وتعلیم کی، پھر ان سے اپنی قوم اور دوسری جماعتوں کی تبلیغ واصلاح کا کام لیا، یہ تبلیغی کام جو انبیاء (علیہم الصلاۃ والسلام) کے طریق کار سے سب سے زیادہ ظاہری مشابہت رکھتا ہے، ان کے دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں کسی طرح کم اہم نہیں۔

دعوت الی اللہ اور اشاعت علم دین کی خدمت

۲- قرآن وحدیث اسلام کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں، جن سے ہمیشہ طاقت اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچہ میں روح پھونکی جاسکتی ہے، شرک وکفر، بدعت وغفلت کے خلاف سب سے کارگر حربہ قرآن وحدیث کا علم اور ان کی اشاعت ہے، ان کا صحیح علم اور ان کی روشنی جس قدر پھیلتی جائے گی، کفر وجہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی، اس لیے ہزار تبلیغوں کی ایک تبلیغ ان کی نشر واشاعت ہے۔

انبیائے کرام کی بڑی خصوصیت ان کی ہم آہنگی اور یک آہنگی ہے، یعنی وہ سب ایک بات کہتے ہیں اور ایک ہی بات کہتے رہتے ہیں، وہ کیا؟

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ [سورة هود: ۵۰]

''اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، تمہارا معبود اس کے سوا کوئی نہیں''۔

ان کے جانشینوں کی بھی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ ان کی تمام کوششوں اور ان کی زندگی کے متنوع مشاغل کا ہدف بھی ایک ہوتا ہے، وہ ''دعوت الی اللہ'' ہے، درس وتدریس، وعظ وتقریر، تبلیغ وتذکیر، تصنیف وتالیف، سلوک وتصوف، بیعت وارشاد سب سے غرض، خلق خدا کو اللہ کی طرف بلانا، اللہ سے ملانا اور اللہ ہی کا بنانا ہوتا ہے، ان کے مشاغل متنوع اور مختلف ہو سکتے ہیں، مگر سب کا مرکز اور مقصد ایک ہوتا ہے، وہ بہت کچھ کہتے ہیں، مگر درحقیقت ایک ہی بات کہتے ہیں، اور بار بار کہتے ہیں۔

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب وروز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

حضرت نوحؑ کی طرح وہ بھی ان مشاغل اور مختلف طرق تبلیغ کی طرف اشارہ کر کے کہہ سکتے ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلاً وَّ نَهَاراً.﴾[سورة نوح: ٥]

''اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن''۔

﴿ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَاراً. ثُمَّ اِنِّيْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَاراً.﴾[سورة نوح: ٨-٩]

''پھر میں نے ان کو بلایا برملا، پھر میں نے ان کو کھول کر اور چھپ کر کہا، چپکے سے''۔

یہ وعظ، یہ درس اور یہ انفرادی واجتماعی کوششیں، یہ ظاہر ومخفی تدبیریں، یہ تذکیر وتزکیہ اور یہ توجہات اور انفاس قدسیہ، اعلان واسرار ہی کی شکلیں ہیں۔ (۱)

---

(۱) ماخوذ از ماہنامہ ''الندوہ'' لکھنؤ (شمارہ جون-جولائی ۱۹۴۲ء) ''دین حق اور علمائے ربانی شرک وبدعت کے خلاف کیوں؟'' (صفحہ ۱۴ تا ۵۶)۔

علمائے دین کا منصب

استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم بسم اللّٰه الرحمن الرحيم۔

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ [سورۃ المائدۃ:۸]

''اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔''

حضرات! علمائے کرام کی اس موقر مجلس میں کچھ عرض کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے، پرانا حکیمانہ مقولہ ہے: ''لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ ''میں کوشش کروں گا کہ اس اہم اور باوقار مجلس اور موقع ومحل کے مطابق اپنے معروضات وخیالات پیش کروں۔

قبلہ نما استقامت کی ضرورت

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں، اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں، اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روزمرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا ہوں، دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہنچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن کن علاقوں سے گزری، لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سی جماداتی چیز جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور

ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے) برابر اپنا رخ بدلتا رہا ہے، ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی، اس سے مجھے غیرت بھی آئی، اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروانہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے، اس نے اپنا مقصد وجود تبدیل نہیں کیا، اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا، اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں ''قبلہ نما'' ہونا چاہیے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہیے، کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ

ع چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں

ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبالؔ (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو۔

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

حضرات! علماء کی شان یہی ہونی چاہیے، امت مسلمہ امتوں میں، اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے، وہ جہاں کہیں ہو اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کرے، جس امت کو ایک معین قبلہ دیا ہے، اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمہارے دلوں کا قبلہ، تمہارا قبلۂ حاجات، تمہاری فکر اور سعی وجدو جہد کا محور ایک ہی ہونا چاہیے، نمازوں میں خانۂ کعبہ اور اعمال و مساعی و مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود و مقصود حقیقی ہے) رضا، آپ حضرات خدا کے فضل سے نہ صرف اہل علم ہیں، بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ

نے دینی قیادت کا مقام عطا فرمایا ہے، خاص طور سے یہ موٴقر مجلس علمی جہاں اس وقت ہم جمع ہیں، میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دو اہم حقیقتوں کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا۔

حدود شرعیہ اور عقائد

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہیے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کرے گا، وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شرعیہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مداہنت اور چیز، حکمت اور مداہنت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو: ﴿اُدْعُ إِلىٰ سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ [سورة النحل: ۱۲۵] لیکن مداہنت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ [سورة القلم: ۹] (۱)، اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [سورة الحجر: ۹۴] یہ ﴿أَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ کا تکملہ، "صَدْعٌ بِالْأَمْرِ" کا محل متعین کر دیتا ہے، جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ پر عمل کا حکم ہے، نرمی اور وسعت کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید وسنت کے بارے میں، منصوصات شرعیہ اور قطعیات دینیہ کے بارے میں ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ کا حکم ہے، اگر ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ مطلق آتا تو اس میں کچھ گنجائش تھی، لیکن ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ نے بالکل تفسیر کر دی کہ اس کا موقع ومحل کیا ہے، علمائے حقانی کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوچ اور صاف بات کہیں، لیکن حکمت کے ساتھ کہیں، بقول غالب ایسا نہ ہو

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بری طرح

---

(۱) وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔

بھلی بات بھلے طریقہ پر کہی جائے، کوئی فتنہ شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی، نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج وحکمت سے کام لیں، لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو، اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کو ہلاکت کا شوق ہے وہ شوق سے ہلاکت میں گر پڑے، لیکن وہ شریعت اور شریعت کے حاملین کو الزام نہیں دے سکتا۔

امت محمدی کی ایک بڑی خصوصیت وامتیاز

تاریخ کا اگر عمیق ووسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہوگئی ہو، مقامی طور پر تو ضلالتیں رہی ہیں لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش یا کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی، اور خود حدیث میں آیا ہے، "لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلَالَةٍ"، [1] اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہوگئی، اور عیسائیت بالکل عہد طفلی اور آغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی جس پر وہ صدیوں سے چلتی چلی آرہی ہے، اسی لیے قرآن مجید نصاریٰ کو ﴿ضَآلِّيْنَ﴾ کے لفظ سے یاد کرتا ہے کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے، لیکن الحمد للہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے، اس وقت تک توحید وشرک کا فرق، سنت وبدعت کا فرق، اسلام اور جاہلیت کا فرق، غیر مسلمین کی معاشرت وتمدن اور اسلامی معاشرت وتمدن کا فرق بالکل واضح ہے، کوئی ملک کسی وجہ سے، کسی خاص زمانہ میں، کسی خارجی یا داخلی سبب کی بنا پر کسی سازش کا شکار ہوجائے یا کسی فتنہ میں مبتلا ہوجائے، یہ الگ بات ہے، علمائے حق اس صورت حال سے نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آرا رہتے ہیں، اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہتی ہے۔

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾، (یعنی تم اللہ کے لیے حق کے علمبردار بن جاؤ)

(۱) رواه الخطيب البغدادي في الفقيه والمتفقه، حديث رقم: ٤١٥

خدائی فوجدار

ہماری زبان اور محاورہ میں ''خدائی فوجدار'' ایک **طنز** کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن ''قوامین للہ'' کا مفہوم تقریباً خدائی فوجدار ہی کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قوامین) سے ''خدائی فوجدار'' ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر ''قائمین للہ'' ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی، کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے، آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، آپ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں، اس آیت میں خطاب اگر چہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں امتیازی شان ہونی چاہیے، ان کو ﴿ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ﴾ حق وصداقت کا گواہ وعلم بردار ہونا چاہیے، اگر امت اسلامیہ کا فرض اقوام عالم کا احتساب ہے، تو علمائے اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا ہے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے، کہاں سے اس نے خط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

حضرات! اسی طرح علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہیے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لیے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے، تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور وہ دعوت واصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے، اور اتنا ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انہوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے، اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر کے باہر پھینک دیا، اس لیے کہ انہوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور

حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ اگر مسلمانوں کو سو فیصدی تہجد گزار بنا دیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنا دیں، لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی طوفان اور وبا کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو رہی ہے، تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد، پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا، اگر آپ نے دین داروں کے لیے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی، اور ان کو ملک کا بے لوث، مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا، جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھیے کہ عبادات و نوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آ سکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جائے، اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے ان کی آنکھیں بند رہیں اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، عوام کے دل و دماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر امت کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، فاتح مصر صحابیِ رسول حضرت عمرو بن العاصؓ نے جس وقت مصر فتح کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بصیرت پر ضرور منکشف کیا ہوگا کہ انشاء اللہ مصر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس تک اسلام کا حلقہ بگوش رہے گا، مرکز اسلام سرزمین مقدس حجاز اس کے بالکل قریب ہے، رومی شہنشاہی وہاں سے بے دخل ہو چکی، قبطی مسیحی سلطنت دم توڑ چکی، لیکن انھوں نے عربوں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: "أَنْتُمْ فِي رِبَاطٍ دَائِمٍ" یاد رکھو تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو، تم ہمیشہ سرحد پر پہرا دے رہے ہو، آنکھ جھپکی اور مارے گئے، ناکے پر کھڑے رہنے والے کو ہر وقت چوکنا اور بیدار رہنا چاہیے، اس کے لیے نہ غفلت کی گنجائش ہے، نہ تغافل کی، نہ جہل کی، نہ تجاہل عارفانہ کی۔

مسلمانان ہند کی ذمہ داریاں اور تقاضے

حضرات! جس ملک میں اس وقت ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس ملک کے حالات

تیزی سے بدل رہے ہیں، یہ ملک گردوپیش کے ممالک اور دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس ملک میں بہت سے فلسفے، بہت سی سلبی طاقتیں، بہت سی تخریبی تحریکیں کام کررہی ہیں، اور بہت سرگرم اور فعال ہیں، نظام تعلیم برابر بدلتا رہتا ہے، اور کبھی وہ شدت سے عقائد وحقائق دینی پراثر انداز ہوتا ہے، جبری تعلیم نے اور قومی زبان نے بھی نئے مسائل پیدا کردیے ہیں، اس حالت میں ہم کو حالات کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہیے، اور اپنے تحفظ کا سامان کرتے رہنا چاہیے۔

اس کے ساتھ مسلمانوں کو بتانا چاہیے کہ دیکھو! اس ملک کو تباہی سے بچانا تمہاری ذمہ داری ہے، تم باایمان، بااصول اور باکردار بن کر یہاں رہو، اگر تم یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام کا نمونہ پیش کروگے، تو پھر وہ وقت آئے گا کہ اہم سے اہم اور نازک سے نازک تر، اور دشوار سے دشوار تر ذمہ داری تمہارے سپرد کی جاسکے گی، حضرت یوسف علیہ السلام نے جن کو اللہ تعالیٰ نے حفیظ وعلیم کی صفت عطا فرمائی تھی، دیکھا کہ اس ملک میں اس وقت تک دین کی اشاعت نہ ہوسکے گی اور دین کے لیے مقام پیدا کیا نہ جاسکے گا، جب تک وہ وہاں اپنی اہلیت، اپنی خیرخواہی، انسان دوستی اور عدل کا ثبوت نہ دیں گے، اور اللہ کے بندوں کو اپنا گرویدہ نہ بنالیں گے، اس وقت تک اس ملک میں خدائے واحد کا نام لینا بھی مشکل ہوگا، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ ثابت کرنا چاہیے کہ ہمارے بغیر یہ ملک چل نہیں سکتا، ہم نہ رہے تو یہ ملک تباہ ہوجائے گا۔

حالات اور ماحول سے بے خبری ٹھیک نہیں

یاد رکھیے، اگر ہم ملک کے حالات سے اپنے کو کاٹ لیں گے، اور جو گرم وسرد ہوائیں چل رہی ہیں، اس سے بے خبر ہوجائیں گے، اور ہم کسی مکیف (Air-conditioned) مکان میں رہنا شروع کردیں گے، جہاں نہ گرم جھونکا پہنچ سکے نہ سرد، تو ہم اپنے ساتھ بھی بدخواہی کریں گے، اپنے دین کے ساتھ بھی، کوئی فرقہ، ملک کی آبادی کا کوئی عنصر باقی عناصر سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، ہاں اس کے شرائط اور حدود ہیں، آپ ہرگز تحلیل نہ ہوں، آپ اپنے پیغام اور

دعوت کے ساتھ رہیں، آپ اپنی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کے ساتھ رہیں، آپ اپنے ملی تشخص کو پورے طور پر برقرار رکھیں، اور اس کے کسی حصہ سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں، لیکن زندگی کے دھارے سے الگ نہ ہوں، میں قومی دھارے کو نہیں کہتا (خدا نہ کرے کہ اس زندگی میں کبھی میری زبان سے یہ لفظ نکلے کہ قومی دھارے میں جذب ہو جائیے) نہیں، زندگی کے دھارے سے آپ الگ نہ ہوں، اس لیے کہ زندگی کے دھارے سے جو الگ ہوا وہ الگ ہی ہو گیا، اس کی جگہ زندہ انسانوں میں نہیں رہتی۔

میں اسلام کو ایسا محدود اور ناقص نہیں سمجھتا کہ اگر حالات اور زندگی کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے تو فرائض چھوٹ جائیں گے، عقائد میں خلل آجائے گا، ہمارے اسلاف نے شہنشاہی کی اور امپائر بنائے ہیں، لیکن ان کی تہجد بھی نہیں چھوٹی، معمولی سنت بھی ترک نہیں ہوئی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ ہے، عراق کے گورنر تھے اور مدائن کے دارالحکومت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گر گئی تو اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے، کسی نے کہا کہ ارے آپ والی ہو کر ایسا کام کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیبؐ کی سنت تم جیسے بیوقوف کی خاطر چھوڑ دوں گا؟ یہ نہیں کہ آگ آئے تو پانی نہیں رہے گا، اور پانی آئے تو آگ بجھ جائے گی، یہ غلط تخیل ہے، آپ پوری عزیمت، شانِ تقوی اور کثرت عبادت کے ساتھ اچھے اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اچھا شہری بن سکتا ہے جو خدا کا صحیح پرستار اور اپنے اصولوں کا پابند ہو۔

آج ہندوستان ہی نہیں تقریباً تمام خالص مسلم ممالک اور عرب ممالک کی بھی حالت یہ ہے کہ وہاں بھی یورپ، امریکہ کے گرم جھونکے آرہے ہیں، نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش برپا ہے، وقت کے نئے نئے تقاضے اور زندگی کے نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ان سے آنکھیں بند کر لینا اور یہ کہنا کہ نہیں، کچھ نہیں ہو رہا ہے، غلط ہے، اس حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جامعیت کا ثبوت دینے کا حیدرآباد میں اور بھی اچھا موقع ہے، یہاں تعلیم بھی ہے اور قوت عمل بھی، یہاں نئے نئے ادارے، نئی نئی تنظیمیں اور تحریکیں

پیدا ہو رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو ایک اجتماعی قیادت اور صحیح مشورے کی ضرورت ہے۔

ہماری ذمہ داری

ایک طرف تو عقائد کے بارے میں، اصول کے بارے میں، شریعت کے منصوصات کے بارے میں پہاڑ کی سی استقامت اور فولاد کی صلابت ہو، دوسری طرف زندگی کے مسائل میں پورا فہم، پوری دانشمندی، پوری باخبری اور پوری ہمدردی، یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو انشاء اللہ ہم موجودہ حالات سے نہ صرف یہ کہ عہدہ برآ ہو جائیں گے، بلکہ مجھے پوری امید ہے کہ قیادت آپ کے پاس خود آئے گی، مسلمانوں میں سیاسی شعور'' الوعي السياسي ''(شہری شعور) الوعي المدني (Civil Sense) پیدا کرنا ضروری ہے، وہ جس محلّہ میں رہیں ممتاز نظر آئیں، اور معلوم ہو کہ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، مسلمانوں کے گھر ہیں، دین کو اس کی حقیقی روح اور مظاہر کے ساتھ ایک خوش اسلوب شہری زندگی، انسانیت دوستی، حقیقت پسندی، ہوش مندی، ملک کے لیے فکرمندی، اس کو بچانے کے لیے خطر پسندی اور مہم جوئی کی ضرورت ہے، اس کے لیے آپ خود نمونہ بنیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ نمونہ پیش کریں۔

وصلى الله تبارك وتعالى على سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وسلم۔ (۱)

---

(۱) ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو مجلس علمی (حیدرآباد) کی ایک نشست میں کی گئی تقریر، جس میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کے علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے، ماخوذ از'' تحفۂ دکن'' (ص: ۳۹ تا ۴۸)۔

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ.﴾[سورۃ فاطر:۳۲]

''پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا، تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں، اور کچھ خدا کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں، یہی بڑا فضل ہے۔''

داعی امت

عزیزو اور بھائیو! دین ہو، آسمانی تعلیمات ہوں، صحیح دعوت یا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ہوں، ان میں سے کوئی چیز خلا میں نہیں رہ سکتی، اگر اس تعلیم و دعوت کے ساتھ انسانی زندگیاں، ان کے حاملین اور زندہ اور عملی پیکر نہ ہوں تو ان کا تسلسل قائم نہیں رہتا، ادیان سماوی کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ اور اخلاقی تعلیمات کی تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتی ہے، اگر ایسا ممکن ہوتا اور سنت الٰہی اور فطرت انسانی اس کی اجازت دیتی تو پھر اتنا کافی ہے کہ آسمان سے صحیفے آجاتے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیے جاتے اور اعلان کر دیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے صحیفے اور آسمانی کتابیں آگئی ہیں، وہ فلاں جگہ محفوظ ہیں، جس کا دل چاہے جائے لے آئے، اور عمل کرے، لیکن پہلے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کی بعثت ہوتی ہے، ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اور اس کا پہلا نمونہ وہ خود ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے آنحضرت (ﷺ) کی

سیرت وحیات طیبہ اور اخلاق وشمائل کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا ”کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“[1] (رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی کو دیکھنا ہو تو قرآن مجید پڑھ لو اور دیکھ لو) اور آنحضرت (ﷺ) کے ساتھ تو اللہ کا خصوصی معاملہ اور مزید انعام یہ تھا کہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے الفاظ میں) آپ کی بعثت ”بعثت مقرونہ“ (دوہری بعثت) تھی، یعنی آپ انسانوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اور آپ کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے اور ان کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک پوری امت کی بعثت عمل میں آئی تھی، اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ تنہا امت مسلمہ کے لیے بعثت یا اس کے ہم معنی اور مرادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، فرمایا گیا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً.﴾ [سورة البقرة: ١٤٣]

”اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ ہیں۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ.﴾ [سورة آل عمران: ١١٠]

”مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔“

اس سے زیادہ صاف الفاظ حدیث میں آئے ہیں، مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ“[2] (تم آسانی پیدا کرنے کے لیے پیدا اور مقرر کیے گئے ہو، مشکلات پیدا کرنے کے لیے نہیں۔)

صحابہ کرامؓ نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ جب

(۱) رواه أحمد في مسنده عن السيدة عائشة رضي الله عنها، حديث رقم: ٢٥١٠٨، ٢٥٨١٦، ٢٦٣٣٣ (٢) رواه أحمد في مسنده عن أبي هريرة ، حديث رقم: ٧٢٥٤، ٧٧٨٦

رستم سپہ سالار افواج ایران نے حضرت ربعی ابن عامر سے جو مسلمانوں کے نمائندہ وسفیر بن کر آئے تھے، پوچھا کہ "تم کیسے آئے؟" "مَا الَّذِيْ جَاءَ بِكُمْ؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے زبان نبوت ہی کے الفاظ استعمال کیے، انہوں نے کہا: "اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحْدَهُ" "اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تا کہ حکم الٰہی سے اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں"، اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ کوئی دین خلا میں نہیں رہ سکتا، دین سے پہلے نبی کی شرط ہے، پھر نبی کے ساتھ امت کی شرط ہے، اس کے اصحاب وتربیت یافتہ نفوس کی شرط ہے، جس کا بہترین نمونہ آپ کو سیرت نبوی میں ملتا ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہیے۔

نائبین انبیاء کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا

میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "توریث" یعنی نائبین انبیاء اور حاملین کتاب کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس طرح وارثین انبیاء، اس امانت کے حاملوں اور دین کے نمائندوں کی بڑی ذمہ داری ہے، اس دین کے بارے میں بھی، اپنے ماحول ومعاشرے اور اپنے ملک کے بارے میں بھی، اور پوری انسانیت کے بارے میں بھی، جس کی قسمت دین صحیح اور آسمانی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." (۱)

"اس علم کے نسل میں ایسے عادل ومتقی حامل ووارث ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔"

---

(۱) أخرجه البيهقي في المدخل إلى السنن، كما ذكره صاحب مشكاة المصابيح في كتاب العلم، الفصل الثاني، حديث رقم: ٢٤٨

وارثین کتاب، نائبین انبیاء اور عام فہم الفاظ میں ''علمائے دین'' کی یہ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنا نازک معاملہ ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر ادراک ہوتو جن لوگوں کو اللہ نے یہ شرف عطا فرمایا ہے، اور ان کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، راتوں کی نیند اڑ جائے اور کھانے پینے کی لذت ختم ہو جائے اور ان کا سکون ہمیشہ کے لیے جاتا رہے۔

حاملین دین کا عمل کے اعلیٰ معیار پر ہونا ضروری

دراصل حاملین وشارحین دین ہی کی سیرت واخلاق پر عوام کی دین سے وابستگی، اس سے عقیدت، اس پر اعتماد، اور صحیح عقائد ومسلک کے بقا کا انحصار ہے، ان کی ذرا سی غلطی کیا اثر پیدا کرسکتی ہے، اس رابطہ کو کتنا کمزور کرسکتی ہے، جو امت اور دین کے درمیان قائم ہے، ان کی اخلاقی کمزوری، جماعت کا اخلاقی تنزل، کردار کی پستی، دنیا طلبی، دولت پرستی، قوت واقتدار کی تقدیس، خواہشات نفس اور ذاتی مفادات کے سامنے سپر اندازی، اور انتشار پسندی پورے معاشرے پر کیا اثر ڈال سکتی ہے، اور اس عہد وملک کی پوری نسل کو کس طرح متزلزل و متاثر کردیتی ہے، اگر اس کا صحیح ادراک ہوتو ہمارے مدارس کے بام ودر ہی نہیں مساجد کے محراب ومنبر بھی کانپنے لگیں، مشہور حدیث صحیح سے بڑھ کر کوئی اس حقیقت کی عکاسی ومصوری نہیں کرسکتا، فرمایا گیا:

''أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ''(۱)

''یاد رکھو جسم انسانی میں ایک مضغۂ گوشت ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورے جسم کا نظام درست رہے گا، اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جائے، خبردار رہو، وہ مضغۂ گوشت دل ہے۔''

---

(۱) رواه البخاري في صحيحه، حديث رقم: ٥٢

خواص کی حیثیت قلب کی سی ہے

علماء وخواص کی حیثیت ملت ومعاشرہ میں بالکل وہی ہے جو قلب کی جسم انسانی میں ہے، اوران کے فساد واختلال اوران کے صلاح واعتدال کا وہی اثر پوری ملت ومعاشرے پر پڑتا ہے جو قلب کے صلاح وفساد کا پورے جسم انسانی پر پڑتا ہے۔

اخلاقی انحطاط کے بدترین نتائج واثرات

عزیزو اور رفیقو! یہ ذمہ داری کسی ایک جماعت یا کسی مخصوص ادارے کی نہیں ہے، یہ پوری صاحب علم جماعت کی ذمہ داری ہے، وارثین کتاب کے اخلاق پر جب انحطاط آئے گا، جب ان کے اندر دنیا پرستی آجائے، جب ان کا تعلق اللہ تعالی کے ساتھ کمزور پڑ جائے گا، جب وہ ان حدود سے بھی تجاوز کرنے لگیں گے جن حدود سے عوام کو بھی آگے نہیں بڑھنا چاہیے، تو پھر پورے معاشرے اور پورے ماحول میں فساد ہی نہیں بلکہ تعفن اور سڑاہند پیدا ہوجائے گی، دین کا مستقبل وابستہ ہے اہل دین واہلِ علم سے، اور کسی ملک اور اس ملک کی آبادی کا اخلاقی، انسانی اور دینی مستقبل وابستہ ہے دین کے شارحین اور دین کے نمائندوں سے، اب دین کے نمائندوں میں کوئی کمزوری پیدا ہوجائے تو دنیا کی کوئی طاقت عوام کے دین کے ساتھ تعلق کو کمزور ہونے سے بچا نہیں سکتی، نہ کوئی حکمت، نہ کوئی ذہانت، نہ کوئی خطابت، نہ کوئی سیاست، یہاں تک کہ اگر کوئی اسلامی حکومت بھی یہ بات طے کرلے کہ اس معاشرے اور اس ماحول میں فساد پیدا نہ ہونے پائے اور اس کا رشتہ دین سے کمزور نہ ہونے پائے تو وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

علماء درحقیقت قطب نما ہیں

یہ بات بالکل ایسی ہے کہ جہاز کی رفتار کو کنٹرول کرنے والی اور جہاز کا رخ متعین کرنے والی ایک چھوٹی سی مشین یا ایک معمولی سا پرزہ ہوتا ہے، اگر بال برابر بھی اس کی سوئی

اپنی جگہ سے کھسک جائے تو جہاز سیکڑوں میل کے حساب سے اپنی منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے، علماء کی جماعت درحقیقت ملت وانسانیت کے لیے "قطب نما" ہے جس سے قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے، اس لیے اس کا صحیح اور سچا رہنا اور اپنا کام کرتے رہنا ضروری ہے، اگر علماء کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہے، اگر ان کے اندر اخلاص واخلاق پایا جاتا ہے، وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مستعد اور سرگرم ہیں، اور ان اعلیٰ صفات سے متصف ہیں جو کسی درجہ میں نائبین انبیاء اور وارثینِ کتاب میں پائی جانی چاہئیں، تو کم سے کم اس ملک میں دین کا مستقبل محفوظ ہے، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر دنیا کی کوئی تدبیر اس ملک میں دین کو بچا نہیں سکتی۔

اسپین مسلمانوں نے کیسے کھویا؟

اندلس (اسپین) پر بڑا تحقیقی کام ہوا ہے، اسلام کے وہاں سے بالکل جلاوطن ہو جانے کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی (خدا کرے اب قیامت تک نہ ملے اور مسلمانوں کو پھر کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آئے) یہ وہ بدقسمت ملک ہے جس کو اسلام کی دولت سے بالکل محروم کر دیا گیا، اس کے اسباب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بڑی بصیرت افروز کتابیں موجود ہیں، مجھے خود بھی خدا نے اس ملک کی زیارت وسیاحت کا موقع دیا، لیکن ابھی تک اس نقطۂ نظر سے تحقیقی کام ہوا ہے کہ وہاں کے حکمرانوں سے کیا غلطیاں ہوئیں، وہاں کون سی سیاسی بے تدبیری اور بے دانشی عمل میں آئی؟ مؤرخین ومصنفین نے اس کی زیادہ تر ذمہ داری حکمرانوں کے اختلاف اور شمالی اور جنوبی عربوں (عدنانیوں اور قحطانیوں یا امویوں اور حجازیوں) کی آویزش ورقابت پر ڈالی ہے۔

لیکن ایک پہلو ایسا ہے جو ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے اور اس پر کام نہیں ہوا ہے، وہ یہ کہ وہاں کے علماء سے کیا غلطیاں ہوئیں؟ انہوں نے کیا کمزوری دکھائی؟ ان کے اندر کیا اخلاقی انحطاط، دنیا طلبی اور انتشار واختلاف کی بیماری پیدا ہو گئی تھی جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش خطرۂ ارتداد

اس وقت ہندوستان بھی ایک نازک مرحلہ پر آگیا ہے، گویا کاتب تقدیر منتظر ہے کہ وہ کیا لکھے؟ اس وقت اگر یہاں بھی علماء نے اپنے کو نہ سنبھالا اور اخلاقی، روحانی، علمی و ذہنی، چاروں راستوں سے اپنی بلندی، اپنا امتیاز اور اپنی افادیت وضرورت ثابت نہ کی، تو اندیشہ ہے کہ پورے دین اور پوری ملت پر زوال نہ آجائے۔ بعض مرتبہ محدود اور بظاہر معمولی اخلاقی کمزوریاں اور اختلافات اتنے مہیب نتائج کا باعث بن جاتے ہیں جن کا تصور بھی مشکل ہے، بعض اوقات وہ پوری سلطنت اور اس ملک میں پوری ملت کو زوال یا شدید آزمائش اور کشمکش میں مبتلا کر دیتے ہیں، ہم جب تاریخ کے ذخیرے میں ٹوہ لگاتے لگاتے اور کرید کرتے کرتے اسباب ونتائج کی زنجیر کے آخری سرے پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں قسم کی ایک نفسانیت، ایک بے دانشی، اجتماعی اور ملی مفاد پر انفرادی مصلحت اور ذاتی مفاد کی ترجیح اس کی اصل ذمہ دار تھی، اور اس سے پوری ملت زوال سے دوچار ہوگئی اور ان میں سے اکثر بہت سی چیزوں کا سراغ دین وعلم کے اصل نمائندوں کی سیرت وکردار میں ملتا ہے۔

علمائے عصر کی ذمہ داری

علماء کی اخلاقی، اس کے بعد روحانی و باطنی، اور اس کے بعد علمی و ذہنی استقامت و بلندی دین کے بقاو تسلسل اور دین کے وقار واعتماد کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے، ایسے موقع پر ایک لمحہ مہینہ اور سال کے برابر ہوتا ہے، اور ایک سانس ایک عمر کے، اس وقت اگر علماء اور علوم دینیہ کے حاملین ومنتسبین نے اپنے کو نہ سنبھالا، انہوں نے اپنی اخلاقی بلندی، اپنی بے غرضی، سچی خدا پرستی کا جس کے اندر نفاق نہ ہو، ثبوت نہ دیا تو سخت خطرہ ہے۔

ہمارا تضاد

ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات بعض مباحات کے استعمال میں احتیاط برتتے ہیں کہ یہ

ہماری وضع کے خلاف ہے، لیکن بے تکلف ایک مسلمان کی پردہ دری کریں گے، افساد ذات البین اور تفریق بین المسلمین میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اس میں کوئی حرج نہیں کہ دو ذمہ داروں کو ایک دوسرے سے لڑادیں، کسی ادارے کی اینٹ سے اینٹ بجادیں، جن چیزوں کی حرمت منصوص ہے مثلاً غیبت، چغل خوری، اتہام، دروغ بافی، وہ ہماری مجلسوں میں دن رات ہوگی، یہ کیا ہے؟ یہ ظاہر داری خدا کے یہاں نہیں چلتی، وہ عالم السرائر و عالم الغیب ہے، وہ ظاہر سے دھوکہ نہیں کھاتا، خیانت حرام، کام چوری حرام، پیسہ لینا اور کام نہ کرنا حرام، مسلمان کی توہین اور عالم کی تذلیل حرام، بے تحقیق و بے ثبوت بات کہنا یا سن کر فوراً اس کو مان لینا اور اس کی اشاعت کرنا حرام، حدیث میں آتا ہے:

”كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ“(۱)

”انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ اس کے کان میں پڑے وہ اس کا چرچا کرنا شروع کردے“۔

قرآن شریف میں آگاہی دی گئی ہے، اور تعلیم و تاکید ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ [سورة الحجرات:٦]

”مومنو! اگر کوئی بد کردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو“

یہ سب منصوصات قطعی ہیں، لیکن ہمارے صحیفۂ اخلاق اور ہمارے اصول وضوابط میں ان کی کوئی اہمیت نہیں، ہمیں انہیں مراتب کے ساتھ اور اس ترتیب و تناسب کے ساتھ جو خدا اور اس کے رسول نے قائم کی ہے، شریعت کے احکام اور دین کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے، محرمات، مکروہات، مستحبات اور مباحات سب کا درجہ الگ الگ ہے، ہم ایک عرفی دین کے پابند ہوگئے ہیں، اور جو چیزیں ہمارے عرف میں ناپسندیدہ اور قابل نفرت نہیں ہیں، ہم بے تکلف ان چیزوں کا ارتکاب کرلیتے ہیں، جن سے بعض اوقات پوری ملت کو نقصان پہنچتا ہے، جن سے اداروں کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی ہے، جن سے ایک متحد اور ہم مسلک جماعت میں سخت انتشار پیدا ہوجاتا ہے، اور اس سے ان تمام مقاصد اور پورے مسلک کو نقصان

(۱) أخرجه مسلم في صحيحه في المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، حديث رقم:٧

پہنچتا ہے جن کی یہ جماعت حامل اور داعی اور ان کی ایک علامت بن گئی ہے، یہ عمارت جو آپ دیکھ رہے ہیں، ایک تناسب پر قائم ہے، اگر یہ تناسب ختم کر دیا جائے تو یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی، دین کا ایوان بھی خاص تناسب پر قائم ہے، وہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عظیم مصلحین کی ضرورت

دوستو اور عزیزو! یاد رکھیے کہ ایسے نازک وقت پر اگر کوئی چیز فوری طور پر زوال سے بچا سکتی ہے تو وہ بلند و بالا شخصیتیں ہیں، دیکھیے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کا علمی و دینی حلقہ اخلاقی طور پر مریض ہو گیا تھا، اور اس کا اثر یہ پڑ رہا تھا کہ ہندوستان میں دین کا مستقبل نہ صرف خطرے میں پڑ گیا تھا، بلکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان کا رخ کم سے کم ذہنی اور تہذیبی ارتداد کی طرف ہے، درباری علماء کا نمونہ کیا تھا؟ اس کو ملا مبارک اور ابوالفضل وفیضی کی سیرت و کردار کے مرقع میں دیکھیے، زیادہ علماء کے نام نہیں لیتا کہ تاریخ کا سو فیصدی اعتبار نہیں، لیکن اس زمانہ کے صدر الصدور اور مخدوم الملک بھی اخلاقی انحطاط کا شکار نظر آتے ہیں، ان کی جاہ پرستی، دولت اندوزی، آپس میں حسد و رقابت اور عزت و اقتدار کے لیے کشمکش کی شہادتیں تاریخ سے ملتی ہیں، ابوالفضل وفیضی کے کردار کے متعلق جو انہوں نے دربار اکبری اور حکومت وقت میں ادا کیا، تنہا ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریروں پر اعتماد کر کے نہیں کہتا، اس کی توثیق خود ابوالفضل کی تحریروں سے ہوتی ہے۔[(۱)]

اس وقت اچانک ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے جس کا نام نامی حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ) ہے، وہ آئے اور انہوں نے کچھ آدمیوں کو تیار کیا، جو اس اخلاقی اور انسانی سطح سے بلند تھے جس پر عام طور پر سرکاری درباری علماء نظر آتے تھے، اور ایک دم فضا بدل گئی

ع جہانے را دگر گوں کرد یک مرد خود آگاہے

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ:۴، ص:۹۲-۱۰۱

اعلیٰ صفات واخلاق کے حامل اور وسیع النظر علماء کی ضرورت

اگر ہمارے ملک کے دینی حلقہ نے بھی جلد کچھ نمونے پیش نہ کیے، اگر جلد پھر ہندوستان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ یا کسی درجہ میں ان سے نسبت رکھنے والی شخصیت، اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ یا ان سے کسی درجہ میں نسبت رکھنے والی شخصیت پیدا نہ کی، علمی وفکری حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ جیسے فضلاء و وسیع وعمیق النظر عالم، علمی رسوخ اور وقت کے تقاضوں سے باخبری میں مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاریؒ، ذہنی واخلاقی بلندی اور خودداری وخود اعتمادی کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزادؒ، روحانی وتربیتی ودعوتی لحاظ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ، مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ جیسے داعی ومربی نہ پیدا ہوئے، تو یاد رکھیے کہ یہاں ہندوستان میں علماء ہی کا وقار نہیں، دین وعلم کا وقار اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر ملت اسلامی کا وقار بھی خطرے میں پڑ جائے گا، اور ان دینی اداروں اور مدارس کی افادیت وضرورت بھی مشکوک ہوجائے گی، جو اسی طبقہ کے افراد پیدا کرنے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔

ان حضرات اور ان کے اسلاف کا ضبط وتحمل، ان کی خودداری اور خدا اعتمادی، ان کی تعاون علی البر والتقوی کی صلاحیت، ان کی ملت کے اجتماعی کاموں میں اپنی بے نفسی کا مظاہرہ، ان کی عالی ظرفی، بلند نظری اور فراخ دلی اور اپنے ہم مسلک ہی نہیں، اپنے مخالفین تک کے کمالات اور محاسن کے اعتراف کی جرأت وتوفیق، ان کا استغناء، اہل دُوَل سے بے خوفی، بے نیازی اور کنارہ کشی، ان کی اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مستعدی وسرگرمی، ان کی زاہدانہ ومتقشفانہ زندگی، ان کا ملت کے لیے حقیقی درد وکرب، یہی وہ صفات ہیں جنہوں نے پہلے بھی ان جماعتوں اور اداروں میں زندگی کی روح پھونک دی تھی، اور زندہ رہنے کا استحقاق پیدا کردیا تھا، اور یہی صفات آج بھی صرف ان اداروں ہی کو نہیں، پوری ملت کو زوال سے بچا سکتی ہے۔

مدارس کے فضلاء، اساتذہ اور طلبہ کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنے اخلاق اور سیرت و کردار میں بھی ممتاز ہوں، اخلاص و تعلق مع اللہ میں بھی کھلا ہوا امتیاز رکھتے ہوں، اور ان کی علمی و فکری سطح بھی بلند ہو، وہ مسائل حاضرہ کو سمجھتے بھی ہوں، اور ان کے حل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں، ان کا مطالعہ بھی وسیع ہو، اور وہ عصر حاضر کی زبان اور اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہوں، اور جدید ذہن کی ساخت و مشکلات کو بھی سمجھتے ہوں، اس مجموعی اخلاقی، روحانی، علمی و فکری بلندی و امتیاز کے بغیر وہ اس عہد انقلاب اور اس دور فتن میں جس میں خود ہماری کمزوریوں اور جدید واقعات نے علمائے دین کے وقار کو مزید مجروح اور دین اور علم پر اعتماد کو مزید متزلزل کر دیا ہے، نیابت انبیاء اور وارثین کتاب کی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتے، ذمہ داری پچھلے عہد سے بھی بڑھ گئی ہے، یہ کسی جماعت علماء، کسی ایک ادارے و مدرسہ کا مسئلہ نہیں، اس ملک میں دین و علم کے مستقبل اور ملت کے دین پر اعتماد اور شریعت و علوم دین سے ارتباط کا مسئلہ ہے، خدا کرے ہم اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اس کو ادا کرنے کی مخلصانہ اور سرفروشانہ کوشش میں لگ جائیں۔ (۱)

(۱) ۸/اپریل ۱۹۸۲ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اساتذہ و طلبہ کے سامنے کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، شمارہ (۲۵/اپریل ۱۹۸۲ء)۔ یہ تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

موجودہ دور کے بے چین ذہنوں کو مطمئن کرنا

علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری

میرے عزیزو! دنیا کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ محفوظ ہے، اور قابل اعتبار ہے، لیکن اس محفوظ تاریخ سے بھی بہت پہلے کی جو تاریخ محفوظ نہیں ہے، اور قابل اعتبار بھی نہیں، اگر وہ تاریخ محفوظ ہوتی اور اس میں نبوتوں کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا، یا سب آسمانی صحیفے جو اپنے اپنے وقت پر نازل ہوئے، وہ سب بے کم وکاست محفوظ ہوتے، ان صحیفوں کے نزول کا پس منظر اور ان کے حاملین نے صحیفوں کی روشنی اور ان کی مدد سے اپنے زمانہ کی انسانی نسلوں کو خدا سے جس طرح مربوط کیا، انہیں دین سے آشنا کر کے صحیح زندگی پر لگایا، اگر یہ محفوظ ہوتا، تو یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ ہر زمانہ میں مبعوث ہونے والے نبی، اس کی نبوت، اس کے پیغام، دائرہ کار، اس کی ذمے داریوں اور اس زمانہ کی ضرورتوں اور نسلِ انسانی کی کمزوریوں، طرزِ فکر اور ان کی زندگی کے ان مراتب میں جس کے ذریعہ سے علمی وعملی، اعتقادی واخلاقی بے راہ روی اور ضلالت داخل ہوتی تھی، خاص ربط ومناسبت تھی۔

ہمارے پاس اس وقت جو محفوظ اور قابل اعتماد تاریخی ذخیرہ اور ریکارڈ ہے، اور قرآن مجید سے ہمیں جو رہنمائی اور اشارے ملتے ہیں، اس سے ہمارے اس دعوے کی تائید وتصدیق ہوتی ہے، اور اس کے چند نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عہد اور دعوت توحید

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس زمانے میں مبعوث ہوئے، اس زمانہ کی سب سے بڑی

خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت کی پوری انسانیت توحید کے مفہوم سے نا آشنا ہوگئی تھی، اور پست ترین بت پرستی میں مبتلا تھی، شرف انسانی اور مساواتِ انسانی کا تخیل لوگوں کے ذہن سے بالکل فراموش ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت وعشق کا عملی تعلق ختم ہوگیا تھا، اور فنائیت ووارفتگی اور اس کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا تعلق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

عزیزو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے جو دور شروع ہوا وہ تقریباً اس وقت تک ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک حدّ فاصل ہے پچھلے اور بعد کے دور میں، اور جیسا کہ میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ دنیا میں دو جو متواتر سلسلے ہیں اگر اس کے لیے عنوان تلاش کریں تو دو عنوان ملتے ہیں: ایک ابراہیمیت کا، دوسرے برہمیت۔ میں نے برہمیت میں 'نون' کو قصداً شامل نہیں کیا، کہ لوگوں کو غلط فہمی ہوگی، اور میرا مفہوم ادا ہو جائے گا، اور اس کا تعلق کسی خاص ملک ونسل اور خاص طبقہ سے سمجھا جائے گا، یہ دو متواتر سلسلے ''ابراہیمیت'' اور ''برہمیت'' ہزاروں برس سے چل رہے ہیں، ایک توحید خالص ہے، جس میں انسانی شرف کا اعادہ اور تجدید ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور فنائیت کا تعلق ہے، اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں توحید کا بار بار تذکرہ ہے، پورے پورے رکوع خصوصاً سورہ ابراہیم کے آخری رکوع کی آیات میں توحید خالص، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی تعلق، محبت، عشق، فنائیت، فریفتگی ووارفتگی اور جاں سپاری کا ذکر ہے، جس کا ایک ثبوت حضرت ابراہیمؑ کے عزیز فرزند حضرت اسماعیلؑ کے گلے پر چھری پھیرنے سے ملتا ہے، اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی:

﴿یـٰٓاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِیْنَ﴾ [سورۃ الصافات: ۱۰۴-۱۰۵]

یہ خصوصیات دین ابراہیمی اور شریعت ابراہیمی کی ہیں، یہ مزاج ابراہیمی اور دعوت ابراہیمی کی خصوصیات ہیں۔

حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمانؑ کا دور اور اس کی خصوصیت

اس کے بعد حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کا زمانہ آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ سلطنتوں کی تنظیم اور صنعتِ انسانی کی ترقی کا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف میں خاص طور سے ملکِ سلیمان کا ذکر کیا ہے:

﴿رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكاً لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِيْ﴾[سورة ص:۳۵]اور

﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ﴾[سورة ص:۳۶]

اس کے بعد جنوں کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں ان کے لیے لوہے کو نرم کرنے کے سلسلے میں ﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ﴾[سورة سبا:۱۰] کا تذکرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور صنعتوں کی وسعت و پھیلاؤ اور ترقی کا دور ہے، اس کی تنظیم کا دور ہے، اس کے بعد ہمارے سامنے یونان کا دور آتا ہے، جو فلسفہ مابعد الطبیعیات، ریاضیات اور طب کی ترقی کا دور کہلاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کی مسیحائی

حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور اور ان کی پیدائش عین یونانی علوم کے ارتقاء کے دور میں ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہم خاص طور سے دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں، مریضوں کو شفا دیتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسیحائی اور ان کے لیے مائدے کے نزول کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے، معجزات کا کثرت سے ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہوتا ہے، غرض کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں جو ماحول تھا، ان میں اور حضرت عیسیٰ کے معجزات میں بڑی مناسبت پائی جاتی تھی۔

خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دور اور اس کی خصوصیات

لیکن حکمت الٰہی نے خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے جس دور کا انتخاب کیا ہے، وہ دور

ہے انسانی ترقی کی وسعت وتنوع کا، زندگی کی وسعت، لطافت، تنوع، پیچیدگی، انسانی ضروریات کا اور علوم وفنون سے انسانوں کے خاص شغف کا دور ہے، چونکہ آنحضرت (ﷺ) خاتم الانبیاء ہیں اور قیامت تک آپؐ کی تعلیمات کو باقی رہنا تھا، اس لیے انسانی زندگی اور انسانی نسل کو اپنے اندر تمام ودیعت شدہ صلاحیتوں، توانائیوں اور کامیابیوں کا گویا ترکش خالی کر دینا تھا، اور اس کے لیے اپنے پورے جوہر دکھانے تھے، اب اس کے بعد سوائے قیامت کے کوئی دور آنے والا نہیں تھا، اس لیے انسان کو اپنی ذہانت، اپنے امکانات، اپنے یافت ودریافت کے امکانات اور وسعتوں کا پورا اظہار کرا دینا تھا، اس لیے کہ اس کے بعد نہ کوئی نبی آنے والا تھا اور نہ کوئی امت پیدا ہونے والی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی کتاب آپؐ کو عطا فرمائی، جو ایک طرف تو ادب وبیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس کا جواب کوئی انسان نہیں لا سکتا، حالانکہ عرب ادب وشاعری کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، دوسری طرف قرآن مجید کے اندر علم کی وسعت کے لیے ایسے امکانات رکھے گئے ہیں اور ایسے اشارے کیے گئے ہیں کہ جب کبھی بھی علم انسانی کی تحقیقات، خواہ کسی میدان کے ہوں، اپنی انتہا کو پہنچیں تو قرآن مجید نہ صرف اس کے امکانات کو ثابت کرتا ہے بلکہ گویا وہ ان کے حقوق کو بتاتا ہے، چنانچہ ﴿عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ اور ﴿رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ کے ذریعہ علم کی جو عظمت ووسعت اور اس کے لامحدود ہونے کو بیان کیا گیا ہے، وہ صرف قرآن مجید میں ملتا ہے۔

اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اس امت کا دامن علم سے باندھ دیا گیا ہے، یعنی یہ امت علم اور عقل انسانی کے قافلے سے، تفکر وتدبر کے کام اور تصنیف وتالیف کے کام سے کبھی بے تعلق نہیں ہو سکتی، یہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ اس امت کا سفر، اس کی سرگرمیاں اور اس کا ذوق ورجحان اور اس کی کامیابیاں علم کے دامن سے وابستہ رہیں گی۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آپ (ﷺ) پر نازل ہوئی اس کی ابتداء "اِقْرَأْ" کے لفظ سے ہوتی ہے، اگر دنیا کے بڑے بڑے عقلاء کو بٹھا کر یہ سوال کیا جائے کہ آسمان کا رشتہ زمین سے ۵۰۰ برس کے بعد قائم ہونے والا ہے، اور انسانوں کو

ایک پیغام دیا جانے والا ہے، یہ بتائیے کہ وہ پیغام کس لفظ سے شروع ہوسکتا ہے؟ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سب کے ذہن میں مختلف الفاظ آسکتے تھے، کوئی کہتا کہ ''اپنے آپ کو پہچانو'' اس لیے کہ اس وقت الٰہی معرفت ناپید ہوچکی تھی، کوئی کہتا ''اُعْبُدْ رَبَّكَ'' اپنے رب کی عبادت کرو، کیوں کہ صحیح عبادت نہیں ہورہی تھی، کوئی کچھ اور کہتا، شاید کوئی بھی یہ نہ کہتا کہ ''اِقْرَأْ'' کے لفظ سے وحی شروع ہوگی، اس لیے کہ جس پر وحی نازل ہورہی تھی وہ امی تھا، جس امت میں وہ مبعوث ہوئے تھے وہ امی تھی: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ [سورۃ الجمعۃ: ۲]، جس کو یہودی اُمی کہتے تھے، اور جس ملک میں اس کو مبعوث ہونا تھا وہ امی تھا، جس شہر میں وحی نازل ہورہی تھی، ڈھونڈنے سے شاید سارے مکہ میں دو چار قلم مل سکتے ہوں، پڑھے لکھے انسانوں کے لیے دنیا میں بہت سے لفظ ہیں، عرب کاتب کا لفظ بولا کرتے تھے، گویا سب سے بڑا امتیاز جو اس ملک کا سمجھا جاتا تھا وہ قلم سے کام لینا تھا، وہاں تحریر سب سے زیادہ مشکل چیز سمجھی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر علم کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے پورا کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت رکھی ہے، اور اس امت اور علم کے درمیان جو رشتہ اس نے رکھا ہے، اسے ہم مقناطیس سے تعبیر کرسکتے ہیں، اسی لیے ہر دور میں اس امت کا علم سے رشتہ باقی رہا ہے، اور اسی لیے ہر دور میں نئے نئے شہسواروں، نئے نئے ماہرین فن اور جینیس انسانوں کو یہ امت پیدا کرتی رہی ہے، اور اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کا موقع دیتی رہی ہے، اگر کوئی ایسا انقلاب نہیں آتا جس میں صلاحیتیں بالکل مسخ ہوجائیں اور انسانی ذہن معطل ہوکر رہ جائے اور کام کرنا چھوڑ دے، جب تک علم کا سفر جاری رہے گا، مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، خواہ ان کا تعلق تمدنی، علمی، معاشرتی، اور سائنسی اور اقتصادی امور سے ہی ہو، مذہب کی روشنی میں ان مسائل کو برابر حل کیا جاتا رہے گا، مثال میں ہم صحابہ کرام، ائمہ اربعہ اور امت کے دیگر مجتہدین کو پیش کرسکتے ہیں، اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہی جاسکتی، صحابہ کرام میں ایسے ذہین اور جینیس انسان تھے کہ انہوں نے روم وایران جیسی ترقی یافتہ تہذیب وتمدن کا مقابلہ کرنے میں ایسی صلاحیت کا ثبوت دیا جس کی نظیر کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کرسکتا، اسی طرح ائمہ اربعہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام

شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے جینیس قانون ساز تھے کہ انہوں نے زندگی اور دین کے رہنما اصولوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں ایسی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ اس پورے عہد میں یہ صلاحیت نہ رومیوں میں تھی، نہ ایرانیوں میں، اور نہ یونانیوں میں تھی، نہ کسی اور قوم میں، یہ لوگ اپنے زمانے کے جینیس ترین انسان تھے، اوران کے کارنامے صدیوں پر محیط ہیں، ان کے کارناموں کی صحیح عظمت واہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ آج آسانی سے نہیں لگایا جاسکتا ہے، کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ جب یونانی علوم عربی میں منتقل ہوئے تو علمی حلقوں پر کتنا غیر معمولی سحر تھا، اور کس طرح لوگ ان کے سامنے مبہوت اور ششدر تھے، اور کس طرح فیشن کے طور پر لوگ باتیں کرنا اوران کی نقل کرنا فخر واعزاز سمجھتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعریؒ، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ بہاؤ الدینؒ، امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور دیگر جینیس شخصیتوں کو اپنے اپنے وقت پر پیدا کیا، جنہوں نے زمانہ کا رخ پھیر دیا، خطرات کا انہوں نے پوری جرأت سے مقابلہ کیا، نوجوان نسلوں کے دل و دماغ کو شکوک وشبہات سے پاک کر کے ایمان ویقین کی بنیادیں از سرنو فراہم کیں، بالکل یہی مرعوبیت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی تہذیب اور جدید سائنس کے بارے میں تھی اور کس طرح لوگ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایمان لاتے تھے، اور اس سے ایسے مبہوت ہوتے تھے کہ اگرچہ دین کا صاف انکار نہیں کرتے تھے، لیکن کشمکش میں ضرورت مبتلا ہوگئے تھے، اس زمانہ کے راسخ العقیدہ خاندانوں کے مشائخ اور صالحین کا حال یہ تھا کہ اگر ان کے والدین کی سرپرستی اور بزرگوں کی صحبت ان کو نہ ملی ہوتی، اور ان کے آغوش میں انہوں نے تربیت نہ حاصل کی ہوتی تو ذہنی واعتقادی ارتداد عام ہوتا اور پورا ہندوستان اس کا شکار ہوجاتا۔

اور اگر اللہ تعالیٰ عین وقت پر دستگیری نہ فرماتا تو نہ معلوم اس ملک کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا، اور یہ صرف ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جب بھی اسلامی تاریخ کے طویل دور میں اس طرح کے حالات پیش آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ہر وقت ایسے افراد پیدا کیے، جنہوں نے اس امت کا رشتہ دین سے باقی رکھا، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہیے۔

مذاہب تاریخ سے نہیں کردار سے سفر جاری رکھتے ہیں

ہمارا یہ فرض ہے کہ اس مہم کو جاری رکھیں، ہم یہ بات اپنے عزیز طلبہ سے کہنا چاہتے ہیں، کسی جماعت میں کسی بڑے عالم و مصنف کا اور مفکر کا پیدا ہو جانا کافی نہیں ہوتا، اوارے یہاں تک کہ ادیان و مذاہب بھی تاریخ سے نہیں چلتے، بلکہ وہ تحریک اور تسلسل سے چلتے ہیں، وہ اپنی افادیت اور صلاحیت ثابت کرنے سے چلتے ہیں، کوئی دینی تحریک کوئی بڑا مفکر پیدا کردے، بلند قامت اور دیو پیکر مصنف پیدا کردے، تنہا یہ کافی نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب کبھی اپنی جماعت کے کارناموں پر فخر کرنے کی کمزوری پیدا ہو جائے تو پھر قوائے فکریہ میں تعطل ہو جاتا ہے، اور اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے، ایک عرب شاعر نے بڑے لطیف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ:

أَلْهَى بَنِي تَغْلِبَ عَنْ كُلِّ مَكْرُمَةٍ
قَصِيدَةٌ قَالَهَا عَمْرُو بْنُ كُلْثُوم

بنو تغلب کو ہر قسم کے مردانہ کارناموں اور کسی بڑی فتح کے حاصل کرنے اور کسی بڑے اقدام سے صرف ایک بات نے روک رکھا ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ صرف عمرو بن کلثوم کا قصیدہ پڑھتے اور سر دھنتے رہتے ہیں، یہ مرض جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا ہے اور اداروں میں بھی، کہ وہ جماعتیں ان کے لیے سرمایۂ فخر، بانیِ جماعت یا اس جماعت کے کسی نامور فرد کی تصنیفات، تحقیقات اور اس کی ذہنی بلندی ان کے لیے سرمایۂ فخر بن جاتی ہے، لیکن اس سے کام نہیں چلتا، جماعت ہو، کوئی ادارہ ہو یا مدرسہ، بلکہ میں اس سے باہر نکل کر کہتا ہوں کہ امت اسلامیہ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دور میں غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کو پیدا کیا، اور ہم نے فلاں فلاں شہر بسائے، سمرقند و بخارا اور غرناطہ، اشبیلیہ اور دہلی ہم نے بسائے، بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں، اور اپنے اپنے دور کی ذہنی واعتقادی بے چینیوں کا جائزہ لیتے رہیں، ان کے اسباب و محرکات تلاش کریں، دین ،حقائق اور اصول و تعلیمات اور زندگی کے واقعات اور زندگی کے عملی مسائل کے درمیان

مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں، ہر دور میں اسلامی قانون کی برتری کو ثابت کریں۔

علوم میں ماہرانہ دسترس حاصل کی جائے

علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا امجد دوہ ہے کہ جو اسلامی قوانین کی برتری دوسرے قوانین کے مقابلہ میں ثابت کرے، علامہ اقبال نے جو بات آج سے ساٹھ برس پہلے کہی تھی، وہ آج کے زمانہ میں ایک عملی حقیقت بن گئی ہے، آج ہمارے سامنے جو سب سے بڑا چیلنج ہے اور ہم لوگ اس کے لیے جدوجہد کررہے ہیں، وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت خصوصاً عائلی قوانین کی معقولیت، افراد اور خاندانوں کے حقوق کی ضمانت کے لیے اس کا سب سے بہتر ہونا ثابت کریں۔

ہم اپنے عزیز طلبہ سے یہ کہیں گے کہ وہ مطالعہ ومحنت سے علوم پر ماہرانہ دسترس حاصل کریں، پھر جدید مسائل سے واقف ہوں، اوران کا دین کی روشنی میں حل پیش کریں، دینی علوم میں اتفاق وگہرائی اور جدید علوم سے واقفیت اور اس کے بارے میں لچک اور نرمی کا موقف ان دونوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔

ندوۃ العلماء کا امتیاز اور پیغام

ندوۃ العلماء کو فخر ہے کہ اس کا انتساب مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے بالغ نظر اور روشن ضمیر اور سیرۃ النبی کے مصنف علامہ شبلی جیسے متکلم وقت، مؤرخ زمانہ اور سیرت نگار یگانہ اور ادیب سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تک علمی ودینی مسائل پر قلم اٹھانے اوران کو سنجیدہ ومؤثر طریقہ سے پیش کرنے کے لیے کم سے کم میرے علم میں علامہ شبلی کے اسلوب سے بہتر کوئی اور اسلوب نہیں، ان ہی کے نقشِ قدم پر سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی اور دوسرے تربیت یافتہ حضرات ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت پر اس سلسلہ کو جاری رکھا، لیکن یہ تنہا کافی نہیں، اور آپ جب الاصلاح کا جلسہ کریں تو مجبور ہوں کہ ان ہی حضرات کا نام لیں، اور اس

فہرست میں اضافہ نہ ہو، یہ اس ادارے کے زوال اور اضمحلال کی دلیل ہے، اور یہ پوری امت کے لیے خطرہ ہے، یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی دائرے میں اس معیار کے لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو مطلوب ہیں، بعض پڑوسی اسلامی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں بھی یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں بھی اب ایسی علمی وفکری قیادت موجود نہیں جو اس نوجوان نسل کی تشفی کا سامان فراہم کر سکے جو براہ راست یورپ سے پڑھ کر آ رہی ہے، کوئی ایسا رسالہ نہیں جس میں جدید تمدنی مسائل کا دین کی روشنی میں حل پیش کیا جاتا ہو، زبان وعلم اور تحقیق کا معیار گر گیا ہے، ہر رسالہ اپنی جماعت، اپنے مسلک اور مخصوص سلسلہ کے بارے میں مضامین شائع کرتا ہے، اگر کوئی تنظیم یا جماعت ہے تو وہ موجودہ حکومت سے بے اطمینانی ظاہر کرنے اور محدود جماعتی وگروہی اور سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کر رہی ہے، یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے کہ علماء جن کا کام ہی یہ تھا کہ نوجوان نسلوں کا اعتماد اسلام پر بحال کریں، اسلام کی حقانیت اور اس کی ابدیت وصلاحیت کو ثابت کریں، اور زندگی کے تمام مسائل میں اس کی افادیت کو ثابت کریں، وہ ذاتی وسیاسی مفاد میں الجھ جائیں، اگر اس امت میں بڑے بڑے صالحین اور اتقیاء اور دین پر جان دینے والے موجود ہوں، جب بھی یہ ضرورت باقی رہے گی۔

ترکی کے المیہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ علماء نے اس دور کے تقاضوں اور نئی نسل کی بے چینی کو رفع کرنے اور اسلام کو سیاسی، مذہبی، فکری، اجتماعی، مسئلہ انتظامی اور قائدانہ حیثیت سے اس کی برتری ثابت کرنے کی صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا، جس کی وجہ سے ترکی لادینیت کی راہ پر لگ گیا، یہی خطرہ مسلم ممالک کے لیے موجود ہے۔

آپ کا اولین اور بنیادی فرض ہے کہ آپ اس کام کے لیے اپنے کو تیار کریں، اور ذہنی وفکری اور علمی قیادت کے خلا کو پیدا نہ ہونے دیں، اور نہ معلوم یہ مرحلہ کب آ جائے، یہ مرحلہ اگرچہ ہر وقت موجود ہے، یہ بات جب ہوگی جب آپ پوری محنت کریں، ماہر اساتذہ سے علوم حاصل کریں، ان میں مہارت اور دسترس پیدا کریں، پورے شوق واحترام سے یہ علوم حاصل کریں، پھر ایک ایک موضوع کا انتخاب کریں، پہلے اجمالی طور پر پھر تفصیلی طور پر مطالعہ

کریں، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی مسند زیادہ دن تک خالی نہ رہنا چاہیے، اس کو آپ کو پُر کرنا ہے، بغیر کسی تخصیص کے میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے آپ کا فرض ہے کہ سب سے پہلے جدید علم کلام، تمدنی مسائل اور نظام تعلیم کی اصلاح و ترقی اور علماء کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کو لیں، سب سے پہلے اس کا خیال ندوۃ العلماء کے بانیوں کے ذہن میں آیا تھا، اس لیے آپ کو حق حاصل ہے، آپ کا فرض ہے کہ زمانہ کے حالات سے واقفیت پیدا کریں، علوم اسلامیہ پر آپ کی نظر گہری ہو، مگر ان کو پیش کرنے کے لیے علامہ شبلی کی زبان اور طرز تحریر، سید سلیمان ندوی کی وسعت معلومات اور سنجیدگی، مولانا عبدالسلام اور دوسرے فرزندان ندوہ کی ادبیت، اس کے ساتھ مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا ناظم ندوی کی عربیت اور عربی زبان پر قدرت کہ مشرق و مغرب میں عربی زبان ہی سے آپ کا واسطہ پڑے گا، آپ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کریں، اور علمی و فکری اور دعوتی تسلسل کو باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ (۱)

---

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی مسجد میں کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رفروری ۱۹۸۷ء)۔

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

دین کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے

اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کر دیا ہے کہ اس کے لیے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے، کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو، اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں، یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لیے ہے، اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہو گئے، جنھوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کر دیے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیے اور جلتے رہنا چاہیے، اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے، اس کا درختِ علم، اس کا درختِ فکر، اس کا درختِ اصلاح اور اس کا درختِ روحانیت نئے نئے برگ و بار لاتا رہے، نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت بارانِ رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لیے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ لکھتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف و تالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچہ میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میں اب بھی اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلاف کے کارنامے، اسلاف کا خلوص وصداقت، اسلاف کا تعلق مع اللہ، اسلاف کی استقامت اور اسلاف کی قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے بہترین سرمایہ ہیں اور وہ حیات وزندگی کا پیغام دینے والی ہیں، ہم نے ہمیشہ کہا اور مانا کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، ان کا علم اتنا وسیع تھا، وہ ایسے متبحر عالم تھے، یہ سب سر آنکھوں پر لیکن اتنا کافی نہیں۔

فیض مردوں سے بھی حاصل ہوسکتا ہے مگر رہنمائی زندوں ہی سے حاصل ہوتی ہے

جس ادارہ اور مکتبِ خیال سے میرا تعلق ہے، اس نے تاریخ اسلام کو مرتب کیا، اس تحتی براعظم (ہند) میں جس ادارہ نے اردو میں تاریخ اسلام مرتب کرنے کی سب سے پہلے سعادت حاصل کی ہے، اس سے میرا تعلق ہے، یعنی ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' اور ''دارالمصنفین''، کسی اور کی زبان سے تو شاید آپ سوچیں کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہے، اور تاریخ سے انصاف نہیں کرتا، میری زبان سے سنیے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا، اس کو محفوظ رہنا چاہیے، اور اسی آب وتاب کے ساتھ رہنا چاہیے، اور نئی نسلوں کو اس سے روشناس کرانا چاہیے، اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلاف کے کارنامے جمع کرنے چاہئیں، لیکن اس دین کے لیے خدا فیصلہ کرچکا ہے کہ یہ دین قیامت تک کے لیے ہے، لہٰذا اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، روحانیت بھی زندہ انسانوں ہی سے قائم ہے، محققین صوفیاء کی اور مشائخ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ تزکیہ وعلم باطن بھی زندہ انسانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے، اور زندہ انسانوں ہی سے اس کی تکمیل ہوتی ہے، ورنہ ایسے ایسے بلند مرتبہ لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک کافی تھا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں حرکت ونمو ہے، زندگی میں تنوع ہے، ابھی ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، ابھی ایک مرض پیدا ہوا اور ایک مرض گیا، اس لیے جن کا تعلق اس زندہ کائنات اور عالمِ طبیع سے ٹوٹ چکا ہے، وہ ان متحرک اور زندہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کرسکتے، فیض ان سے حاصل

ہوسکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو، لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں، لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں، جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہادِ فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

دین تازہ ہوتا رہے گا

حدیث صحیح میں ہے کہ ''إِنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ لِھٰذِہِ الۡأُمَّۃِ عَلٰی رَأۡسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنۡ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیۡنَھَا''(۱) سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا، جو اس دین کو تازہ کر دے گا، اور تجدید کا فرض انجام دے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کر دے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا، ''مَنۡ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیۡنَھَا'' کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لیے دین کا چرچا ہو گیا اور چلے گئے، ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی تھی، (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرالی کہتے تھے، لوگ اس کو ٹھیلتے تھے، اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے، اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر دھکا دیتے تھے، اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھیے اور اس کو ٹھیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجددین ہیں، یہ اس کو ٹھیل دیتے ہیں، اور وہ خود اپنے پہیوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پہیوں پر، لیکن اس کو ٹھیلنے اور چلانے کے لیے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے، وہ کوئی ٹیکنکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ٹھیلتے ہیں، اور وہ اپنے پہیوں پر چلتی ہے، کیونکہ ٹرالی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت

(۱) أخرجه أبو داود في سننه، حديث رقم: ٤٢٩١

ہے، پٹریوں میں اتنی چکناہٹ اور پہیوں میں اتنی حرکت وسرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے، اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو ٹھیل سکیں، اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے، تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکا لگاتا ہے، اور پھر وہ خود چلتی ہے، اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک وبدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھیے، ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑھے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے، اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے، پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہوا اور اس کے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پورا خاندان حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہوا، اور ان کے کام کے اثرات تیرھویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت

کل میں نے دارالعلوم کورنگی میں ایک بات کہی تھی کہ عالم اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں، اور نئے مسائل کے حل پیش کرسکیں، اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے، کتاب وسنت کی مدد سے، اصول فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کرسکیں، اس لیے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے، وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے متبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، اور دوسرے علماء جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آئے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کرگیا ہے، اور اب زمانے کے فتنے اتنے سنگین اور

زمانے کے چیلنج اتنے شدید ہیں کہ حقیقۃً ضرورت تھی امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی، لیکن اگر حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ اس وقت نہ پیدا ہوں تو کم از کم اس درجہ کے لوگ پیدا ہوں جن کے نام میں نے لیے، لہٰذا مدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں، کہ وہ تبحر پیدا ہو، وہ وسعت نظر اور عمق اور نظر کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو، اور وہ کتاب وسنت کی روح سے واقفیت پیدا ہو، مقاصد شریعت سے آگاہی پیدا ہو کہ بدلے ہوئے زمانہ میں امت کی رہنمائی کر سکیں، محض یہ کہ کتاب میں دیکھ لو، یہ کافی نہیں، اس لیے کہ کتابیں تو اپنے اپنے عہد میں لکھی گئی ہیں، اللہ نے صرف کتاب اللہ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ ''لَا تَبْلَى جِدَّتُـهُ وَلَا تَنْتَهِي عَجَائِبُهُ '' کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی، باقی ہر انسانی کتاب میں اس عہد کی چھاپ ہوتی ہے، اس عہد کے گھنے سائے ہوتے ہیں، آپ کسی عالم کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اگر اللہ نے آپ کو ذوق اور علمی بصیرت دی ہے تو آپ اسے دیکھ کر زمانے کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب فتنۂ تاتار سے پہلے لکھی گئی ہوگی یا فتنۂ تاتار کے بعد لکھی گئی ہوگی، یہ آٹھویں صدی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ہر صدی کا اسلوب الگ ہوتا ہے، فکر اور علم کا طرز الگ ہوتا ہے، ان کے درجات الگ ہوتے ہیں، یہ مدارس بہت مبارک اور نہایت ضروری ہیں، ہم سب مدارس ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں، اور میں جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بات کہہ رہا ہوں، یہ مدارس ہی کا فیض ہے، اول سے آخر تک میری تعلیم اسی نہج پر ہوئی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں (اور خدا کرے کہ میری بات جتنی ہے اور جس درجہ کی ہے، اسی کے مطابق سمجھا جائے) کہ یہ دین زندہ ہے، اور زندہ انسانوں کی اس کو ضرورت ہے، اور زندہ انسانوں ہی کے دم سے یہ چلے گا، اسلاف کی عظمت میں رتی برابر کمی کرنا مقصود نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس پر قناعت نہیں کرنی ہے کہ اسلاف نے یہ کیا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے تو کہیے کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک بڑا عالم پیدا ہوا، آسمانِ علم، جبلِ علم، سائل کہتا ہے کہ کنویں میں فلاں جانور گر گیا ہے، تمام محلہ والے پریشان ہیں، کتنے ڈول پانی نکالا جائے؟ آپ کہیں کہ ہمارے یہاں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے، امام زفرؒ پیدا ہوئے، اور آخر میں ''بدائع الصنائع'' کے مصنف،

''البحر الرائق'' کے مصنف اور ''فتاویٰ عالمگیری'' کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا: حضرت! یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتایئے، نماز کا وقت بالکل قریب ہے، کہ اس کو کس طرح پاک کیا جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتایئے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا جواب نہیں، عبدالقاہر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زمخشری پیدا ہوئے، حریری پیدا ہوئے، اور قاضی فاضل پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہوئے ہیں، وہ کہے گا: یہ سب ٹھیک ہے، لیکن میں کتاب پڑھانے جا رہا ہوں، طالب علم منتظر ہیں، جلدی سے شعر کا مطلب بتایئے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے، جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر شہر میں متبحر آدمی ہونے چاہئیں

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے متبحر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کرسکیں، رہنمائی کرسکیں، یہ نہ کرسکیں، تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں، ان سے پوچھو ''لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ'' ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں، علامہ ابن حزم کے متعلق امام ابن تیمیہؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے ''سعی'' میں ''رمل'' و ''اصطباغ'' کو لکھ دیا ہے، وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو حج کرنے کا موقع نہیں ملا، تو ان کو طواف اور سعی میں التباس ہوگیا، یہ بات الگ ہے لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی فہرست گنانے لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجیے، تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی سبیلیں لگی ہیں اور ایسی ایسی آئس کریمیں ایجاد ہوئی ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے نام لینے سے اور اس میں جو ترقیاں آپ کے اسلاف نے کیں، اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی چاہیے، چاہے آپ کٹورہ میں دیں یا مٹی کے کوزہ میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بجھے گی۔

خلا پر کرنے کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں، آج خطرہ اسی بات کا ہے، جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے، آپ سے کیا کہوں، یہ کہنے کی بات نہیں، ہندوستان میں ہم کیا خلا محسوس کر رہے ہیں، کسی مدرسہ میں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے، شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، کہیں اصول فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کچھ اللہ کے بندے یہاں آ گئے اور کچھ اللہ میاں کے یہاں چلے گئے، ایک انتقال کیا تو دوسرا منتقل ہو گیا، ہمارے حق میں نتیجہ ایک ہوا، مطلب یہ ہے کہ خلا پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہو سکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جید عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو تو اس کے لیے پتا پانی کرنے کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ نہ سہی، غلو نہ سہی مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہیے، یورپ میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمنی گئے تھے، انہوں نے کہا: ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں؟ آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے؟ تو اس نے کہا: ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے کھلتا ہے؟ اس نے بتایا اتنے بجے، تو آ کر کہہ دیا کہ اتنے بجے سے، میں نے کہا کہ کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا؟ تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، میں اتنی صبح آ جاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جائیے، پچاس چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی، آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے، آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی

یکسوئی ختم کردیں گی، اور اگر ٹیلی ویژن ہورہا ہے، تو سبحان اللہ یا اناللہ کہہ دیجیے، اُس زمانہ کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں، اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا کہ دو پہر کو وہ گھر جاتے تھے، اور کھانا کھاتے تھے، اور آجاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں تو آیا تھا، میں نے کھانا بھی کھایا! اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا، اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مثقف اور مہذب تھے کہ انہوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانے میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دستر خوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انہوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے اور اپنی جگہ آگئے، اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالیؒ نے غالباً ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے، کہ امام شافعیؒ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے گھر آئے، امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعیؒ کے لیے دعا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ''اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے'' وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں، ان کے استاد کیسے ہوں گے جن کے لیے یہ دعا کرتے ہیں؟ تو ایک مرتبہ پوچھا کہ اباجان! آپ کس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کیوں؟ انہوں نے کہا ''یَابُنَيَّ! إِنَّهُ كَالشَّمْسِ لِلدُّنْيَا وَالْعَافِيَةِ لِلْبَدَنِ'' ایک مرتبہ لطیفہ یہ پیش آیا کہ امام شافعیؒ تشریف لے آئے، تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارات کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کر کے بستر پر لیٹے، تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب بڑا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انہوں نے لوٹا بھر کر رکھ دیا کہ رات کو اٹھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے، لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ آئے اور

انہوں نے اٹھایا، وہ اٹھے اور بے وضو کیے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ! قصہ کیا ہے؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا رکھا ہے، بڑی حیرت کہ انہوں نے بے وضو نماز پڑھی، اس زمانے میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آکر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل سے امام شافعیؒ نے کہا کہ ابوعبداللہ! رات کو عجیب واقعہ پیش آیا، جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف ذہن چلا گیا، میں نے اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کیے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کر کے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہوگئی، اسی لیے شاعر نے کہا ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اگر بدگمانی کا دور ہوتا تو اخبار میں چھاپ دیا جاتا کہ ایسے ایسے علماء ہیں جو بے وضو نماز پڑھ لیتے ہیں، بلکہ پڑھا بھی دیتے ہیں (تعجب نہیں کہ انہوں نے نماز پڑھائی بھی ہو، بھلا ان کی موجودگی میں کون نماز پڑھاتا)۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمائے۔ (۱)

---

(۱) مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن (کراچی) میں ۱۳؍جولائی ۱۹۷۸ء کو طلبہ کے سامنے کی گئی ایک اہم تقریر، ماخوذ از "دعوت فکر و عمل" صفحہ ۲۰۸ تا ۲۱۹۔

عہد حاضر کا چیلنج اور علماء کے فرائض

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾[سورة الجمعة:٢]

حضرات ذمہ دارانِ جامعہ، اساتذۂ جامعہ، اور عزیز طلبہ!

مجھے آپ کی اس مجلس میں شرکت سے مسرت ہے، اور یہاں میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا، اور مجھے محسوس بھی نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ سب حاضرین ہم زبان اور ہم خیال ہیں، اور ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی قافلہ کے مسافر ہیں، علمِ دین کا قافلہ اور اسلام کی دعوت اور ترجمانی کا قافلہ۔

عصرِ جدید کا چیلنج

میں سمجھتا ہوں کہ عصر جدید کا سب سے بڑا فتنہ اور جدید اصطلاح میں چیلنج، مادیت، نفس پرستی اور دولت ہے، یہ فتنہ ہر زمانے میں رہا ہے، لیکن یہ فتنہ اس زمانے میں جس طرح منظّم، طاقتور دلائل اور فلسفوں سے مسلح سامنے آیا ہے، اس طریقہ سے کبھی نہیں آیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ دور میں مادیت کے عروج کے زمانے میں بھی جو لوگ مادیت کے نقطۂ عروج پر تھے، وہ بھی احساس کمتری کا شکار تھے، وہ اپنی عادتوں کے غلام اور دولت و اقتدار کے پرستار تھے، لیکن ان کو اس پر فخر نہیں تھا، بلکہ وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے نظر آتے تھے، ان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم کوئی غلطی کر رہے ہیں، ہم اپنے نفس کی تسکین تو کر رہے ہیں، لیکن دماغوں کی تسکین سے عاجز ہیں، آپ اس زمانے کی تاریخ پڑھیے اور مادیت کے علمبرداروں کی نفسیات کا مطالعہ کیجیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ کی جو روحانی ہستیاں تھیں، بلکہ جو لوگ پستیوں سے

بلند تھے، یہ دنیا دار اُن کے سامنے جھک جاتے، اُن کا ادب کرتے تھے، اُن کے سامنے آنے سے کتراتے تھے، شرماتے تھے، ان سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتے تھے، ان کے پہلو میں نفس لوامہ تھا، یعنی وہ ضمیر جس کو اپنے جرم کا حساس ہو، ان کا ضمیر بھی اس قسم کا تھا، سارے مظالم کے باوجود وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ٹھیک راستے سے ہٹ گئے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ جو مادیت کے بام عروج پر تھے، وہ بھی بعض مرتبہ خلوتوں میں روتے تھے، اور بعض مرتبہ جب ان کا ضمیر بیدار ہوتا تھا، اپنی زبان سے اقرار بھی کر لیتے تھے کہ ہمارا راستہ غلط ہے اور ہم نفس پرستی کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مشرقی اور مغربی کیمپ کا واحد نقطۂ نظر

لیکن اس زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ مادیت کو ترقی وشائستگی کا منتہی سمجھا جاتا ہے، مادیت کے بارے میں مغربی اور مشرقی کیمپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف صرف یہ ہے کہ مادیت کی تنظیم کس طرح کی جائے اور یہ کس فلسفہ اور کس مکتب فکر کے ہاتھ میں رہے؟ امریکہ کا اصرار ہے کہ اپنی ملکیت میں آزادانہ تصرف اور اس کے استعمال کی آزادی رکھنے کا اصول صحیح ہے، اور مشرقی کیمپ، روسی کمیونسٹ بلاک اس پر یقین رکھتا ہے، اور اس کی دعوت دیتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ یا خاندان کی اجارہ داری غلط ہے، وسائل زندگی کو عام کرنا چاہیے اور اس میں پوری مساوات ہونی چاہیے، اور اس کا اختیار حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، لیکن زندگی کس طرح گزارنی چاہیے؟ زندگی کی طاقتوں کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ زندگی کی تنظیم کس طرح کی جائے، اور وسائل ومقاصد میں کس طرح ہم آہنگی اور تعاون ہونا چاہیے، پھر اس کے نتائج سے کس طرح متمتع ہوا جائے اور اپنے زندگی کا منتہی، منزل مقصود کس کو بنانا چاہیے؟ انسان کی ترقی کا راز کس میں پنہاں ہے؟ اس بارے میں ان دونوں فلسفوں میں کوئی اختلاف نہیں، وہ دونوں اس چیز کے قائل ہیں کہ اصل چیز لذت، عزت اور ارادہ کی آزادی ہے، جو جی میں آئے کرنا اور اپنے نفس کو تمتع کا پورا موقع دینا، اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنا اور نفس کے جو حقوق ہیں، ان کو پورا کرنا، اس مادی جسم کو، گوشت پوست کے جسم کو آرام

پہنچانا، یہی اصل مقصود ہے، نہ کہیں سے آئے تھے، نہ کہیں جانا ہے، نہ کسی کے سامنے حساب کتاب پیش کرنا ہے، اور نہ اس سے بلند و بالا کوئی فلسفۂ اخلاق ہے، نہ فلسفۂ روحانیت ہے، نہ کوئی فلسفۂ عقائد ہے، اور نہ اس کے علاوہ کوئی حقائق ہی ہیں، حقیقتِ مطلق، حقیقتِ کلی یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں اس لیے آئے ہیں کہ ہم اس کے ذخائر اور مواقع سے فائدہ اٹھائیں، ان کو آپس میں بانٹ کر کھائیں، اور زندگی کا لطف اٹھائیں، اس میں جو چیز بھی حائل ہو اس کو دور کر دینا چاہیے، یعنی مقصد ہے تو نفع اٹھانا، لیکن جو چیزیں حائل ہیں، ان کی تعیین میں ان کو اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے: اس میں شاہی حائل ہے، ایک خاندان کی مطلق العنانی حائل ہے، کوئی کہتا ہے: اس میں ذاتی ملکیت حائل ہے، کوئی کہتا ہے: اس میں سرمایہ حائل ہے، اور سرمایہ داری کا استحصال حائل ہے، کوئی کہتا ہے کہ غلط تقسیم اس میں حائل ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس میں جہل حائل ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس میں اچھے ادارہ اور طاقت کا فقدان - جو ان سب وسائل کو سب پر تقسیم کرے - حائل ہے، غرض یہ کہ جو اجزاء اور عوائق ہیں، ان کے درمیان اختلاف ہے، لیکن مقصود میں کوئی اختلاف نہیں، اس زمانے میں مادیت کی جو تنظیم ہوگئی ہے، جس طرح اس کو ریفائن (Refine) کیا گیا ہے، جیسے شاندار نام دیے گئے ہیں، جس طرح اس پر خوب صورت لیبل لگائے گئے ہیں، جس طرح اس دکان پر شاندار سائن بورڈ آویزاں کیے گئے ہیں، جس طرح اس کے پیچھے ذہین ترین اور لائق ترین افراد کی توانائیاں اور صلاحیتیں کام کر رہی ہیں، جس طرح مادیت کو عام کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنانے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں، ہمارے علم میں انسانی تاریخ کے کسی دور میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

سب سے بڑا چیلنج مادیت

اس طرح اس دور کا سب سے بڑا چیلنج مادیت کا چیلنج ہے، یہ ایک ایسی کلی حقیقت ہے، جس کے اصول و انواع تو سیکڑوں ہو سکتے ہیں، لیکن جنس ایک ہے، جنس ہے مادیت، اب اس کے انواع میں سرمایہ داری ہے، اشتراکیت بھی ہے، اشتمالیت (کمیونزم) بھی ہے، اور

دوسرے اقتصادی فلسفے بھی ہیں، لیکن سب کا منتہی اور "نقطۂ جامعہ"، قدر مشترک (Common Factor) مادیت ہے، نفس پرستی ہے۔

وہ حقائق جو مادیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں

جب انسان اپنے پیٹ کا، اپنے معدے کا غلام تھا، اپنے اندرونی سفلی خواہشات کا غلام تھا، جب انسان دولت، عورت، زمین کے سوا کسی کو حقیقی نہیں مانتا تھا، جب دنیا کی کثیر آبادی مخلوق کے سامنے جھکتی تھی، اور اس کے سامنے دبتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ اس عالم سے ماوراء ایک عالم ہے، وہ عالم اس عالم سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ رقیق، کہیں زیادہ حسین اور جمیل ہے، اُس عالم کو اگر تم دیکھ لو تو اس عالم کو گوارا کرنا مشکل ہوگا، اِس عالم میں زندگی گزارنا ایسا ہوگا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے کسی آزاد پرندے کو کسی پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ پنجرا بھی بہت تنگ ہو، وہ پھڑ پھڑانے لگتا ہے، اسی طریقہ سے اگر تم اُس عالم کو دیکھ لو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں اور تم کو اِس دنیا سے گھن آنے لگے، جس دنیا کو تم سب کچھ سمجھ رہے ہو، جس دنیا پر تم اپنی عزیز متاع، روحانیت کی، علم کی، اخلاق کی قربان کر رہے ہو، اس عالم سے تمہیں گھن آنے لگے، جس طرح کسی کو ایک منٹ کے لیے گندگی کے کسی بہت بڑے ذخیرے پر کھڑا کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور اس کو متلی آنے لگتی ہے، یہ وہ چیز ہے، جو قرآن نے، صحف سماوی نے اپنے اپنے طور پر بیان کی ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ [سورۃالنساء: ۷۷] ، کہیں حطام کے لفظ سے اس کی تعبیر کی، کہیں زرع کے لفظ سے ادا کیا، یہ حطام ہے، یعنی چورا ہے، جیسے کھیتی کا چورا ہوتا ہے، ویسے ہی یہ بھوسا ہے، کہیں ﴿كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ﴾ [سورۃ الفتح: ۲۹] کسان کی کھیتی لہلہائی تو اس کو بڑی بھلی لگی اور اس کی رال ٹپکنے لگی، اور اس نے کہا کہ کیسا اچھا یہ چمن ہے جو کھلا ہے، کیسی یہ کھیتی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد خزاں کا ایک جھونکا چلا، یا کسان کی درانتی اس پر چلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

سب سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کی یہ حقیقت منکشف کی کہ دنیا بچوں کا کھیل ہے، جیسے ریت پر بیٹھے وہ گھر بناتے ہیں، محل بناتے ہیں، گھروندے بناتے ہیں، پھر اپنے ہاتھ سے توڑ دیتے ہیں، پھر بناتے ہیں، تو خوش ہوتے ہیں، اور پھر خود ہی توڑ دیتے ہیں، بازیچۂ اطفال ہے، یہ دنیا ان عقلاء کے سامنے، عارفین کے سامنے اللہ نے یہ حقیقت منکشف کی، اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو یہ سب کچھ نظر آجائے گا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

بغداد میں ایک مرتبہ ہم نے وہ میوزیم دیکھا جو ماقبل تاریخ کے مختلف تمدنوں، مختلف تہذیبوں، وادیٔ فرات کی تہذیبیں، نمرود وغیرہ کا زمانہ اور نہ معلوم کون کون سی سلطنتوں کے آثار تاریخی یادگار کے طور پر سجائے رکھے ہیں، پھر اس کے بعد تاریخ کا سفر کرتے کرتے عہد عباسی، اس کے بعد سلجوقیوں کا زمانہ، تاتاریوں کا زمانہ اور مغلوں کا زمانہ، ترکوں کا زمانہ، انگریزوں کا زمانہ، فیصل بن حسین کا زمانہ سامنے آیا، آپ یقین مانیے، اتنے دیر میں مجھے دنیا کے تغیر وتبدل سے متلی آنے لگی، جیسے کوئی کڑوی چیز کھائے یا کوئی اوورڈوز (Overdose) ہو جائے، میں تھک گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب تماشا ہی تماشا ہے، یہ وہ سلطنتیں ہیں جن کو زوال کی منزل طے کرنے میں اور ختم کرنے میں ہزار سال، کسی کو پانچ سو برس لگے ہیں، مگر ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ گھنٹوں کا معاملہ ہے، جو محض دھوکہ تھا، یا خواب تھا، جن کو لوگ سمجھے ایک ہزار برس تھا، ہم نے ان کا انجام دیکھ لیا، ہم ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں انسانیت کا ملبہ ہے، اور ملبے پر کھڑے ہیں، ایسے ہی ہمارے بعد جو لوگ آئیں گے، اور وہ یہی دیکھیں گے ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ﴾ ہم جس کو طویل سمجھ رہے ہیں وہ کتنا قلیل ہے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے

خدا کو اس دنیا کو آباد رکھنا ہے، اس لیے خدا نے یہ دنیا عام انسانوں پر ایسی منکشف نہیں

کی ہے جیسے عارفین پر منکشف کی تھی، ورنہ یہ دنیا ویران ہو جاتی، اس دنیا میں مکان بنانے میں کسی کا دل لگتا اور نہ کارخانہ اور فیکٹری قائم کرنے میں کسی کا دل لگتا، یہ حکمت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو آنکھوں سے روپوش کر رکھا ہے، ورنہ اگر یہ حقیقت منکشف ہو جائے اور آخر میں جو کچھ ہونے والا ہے، پہلے اگر دکھا دیا جائے تو انسان سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا، یا تو اس کا دم نکل جائے گا، یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا اور انگلی ہلانا اس کا مشکل ہو جائے گا، یہ تو انبیاء علیہم السلام کا جگر اور ان کے نائبین کا جگر تھا کہ سب جانتے ہوئے، انہوں نے دنیا کے حقوق ادا کیے، رہے تو سلیقہ کے ساتھ رہے، ذوق کے ساتھ رہے، اطمینان کے ساتھ رہے، عزم کے ساتھ رہے، اپنی صلاحیت کو انہوں نے استعمال کیا، جس شہر میں رہے، جس محلّہ میں رہے، اس کو صاف کیا، لیکن دل انہوں نے ایک منٹ کے لیے بھی اس میں نہیں لگایا اور برابر کہتے رہے: ''اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْآخِرَۃِ'' کیونکہ اس کا انجام جانتے تھے، اور پھر اس کے بعد انہوں نے تعمیر بھی کی، مسجدیں بھی بنائیں، اسلام بھی پھیلایا، فتوحات بھی کیں، ملکوں کو اللہ کی قلمرو میں شامل بھی کیا، نئے نئے علوم وفنون وجود میں لائے، تاریخ کی انہوں نے ایسی بنیاد رکھی جو آج تک مستحکم ہے، یہ سب کچھ کیا، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو آخری منزل نہیں سمجھتے تھے، وہ اس دنیا کو ابتدائی منزل سمجھتے تھے، اور یہی ہم میں اور ان میں فرق ہے۔

مادیت کے راکب یا مرکب

اُس وقت مادیت کا جو جادو تھا، وہ جادو وہ لوگ توڑتے تھے جو اُس مادیت سے اپنے آپ کو آزاد کر چکے تھے، جو مادیت کے غلام نہیں تھے، جن کا یہ حال تھا کہ مادیت کو انہوں نے تابع کر رکھا تھا، وہ مادیت کے تابع نہیں تھے، مادیت کے راکب تھے، مادیت کے مرکب نہیں تھے، آج اصل فرق یہ ہے کہ مادیت کے ہم مرکب ہیں، یا ایسے بے اختیار راکب کہ

ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور یہ ہماری حالت ہے کہ جیسے کوئی گھوڑا چھوٹ جائے اور اس کا راکب بے اختیار

ہوجائے، مادیت ہمیں سرپٹ دوڑائے لیے پھر رہی ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس گھوڑے کو کس طرف موڑیں گے، اور اس کو کس طرح چھوڑیں گے، دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں، خندق میں لے کر کود جائے گا، کسی کھائی میں چھلانگ لگائے گا، سمندر میں کود جائے گا، ہمیں پتہ نہیں، تو اس وقت ہمارے پورے تمدن کا یہ حال ہے کہ تمدن ہمارے اختیار میں نہیں رہا، تمدن کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے، مادیت کو ہمیشہ ان لوگوں نے چیلنج کیا اور ان لوگوں کے چیلنج کو اس نے قبول کیا جو اس سطح سے بلند تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قناعت کی دولت عطا فرمائی تھی، جو بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ بادشاہوں سے اس طرح باتیں کرتے تھے، جس طرح مریضوں سے باتیں کرتے ہیں، وہ ان کو مریض سمجھتے تھے، ان پر رحم کھاتے تھے، اپنے حال پر خوش تھے، ان کو ان بادشاہوں پر ترس آتا تھا کہ غریب کس مصیبت میں گرفتار ہیں، اور اس میں تصنع نام کو نہ تھا، واقعی ان کے دل میں درد ہوتا تھا، دیکھیے! ربعی بن عامرؓ سے رستم نے جب پوچھا کہ تم کیسے آئے؟ تو کہا کہ تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا کی وسیع فضا میں داخل کرنے آئے ہیں، میں نے ابوظبی کی ایک تقریر میں کہا کہ اگر وہ اللہ کا بندہ کہتا کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں داخل کرنے آئے ہیں، تو مجھے ذرا تعجب نہ ہوتا، یہ تو ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ''اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ''،(۱) دنیا تو ایک قفس اور پنجرا ہے، لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اللہ کے اس بندے نے جو پیٹ پر پتھر باندھتا ہوگا، جس کے پاس ضرورت کا راشن نہیں ہوگا اور جسم پر چیتھڑے لپیٹے ہوگا، کیا دیکھ کر اس نے کہا کہ ہم تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر جس میں تم بند ہو، وسیع فضا میں منتقل کرنے کے لیے آئے ہیں؟ کیا عرب کی فضا وسیع تھی؟ کیا عرب میں وسائل معیشت محدود ہی نہیں بلکہ تقریباً معدوم نہیں تھے؟ پیٹ بھر کھانا بھی لوگوں کو نہیں ملتا تھا، جہاں وہ اونٹوں کی کھال کے بنے ہوئے خیموں کے اندر اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑوں کے اندر رہتے تھے، جہاں ان کو نیا شکار مل گیا یا اپنے ہی اونٹوں کو ذبح کر لیا تو گویا ان کی عید ہوگئی، اس دن معلوم ہوتا تھا کہ رزق کے دروازے کھل گئے، کیا دیکھ کر اللہ کے اس بندے نے کہا کہ تم اپنی خبر لو، تم تو پنجرے میں گرفتار ہو، تھوڑے سے دانے ڈال دیے گئے ہیں، اور تم اس کو کھا کر

(۱) أخرجه مسلم في كتاب الزهد والرقائق، باب الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر، حديث رقم: ۷٤۱۷

خوش ہور ہے ہو، ہم آئے ہیں تا کہ تم کو آزادی دلائیں، یہ مسلمان کی اس وقت کی نظر تھی، اور یہ اس وقت کے علمائے ربانی تھے، لوگ ان کے پاس جا کر مادیت کا علاج کراتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بلا میں مبتلا ہیں، اور یہ لوگ کیسا عیش کر رہے ہیں، اور کیسی جنت میں رہ رہے ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مقولہ ہے: "اَلْجَنَّۃُ فِيْ صَدْرِيْ" میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، اس لیے کہ ان کو اللہ پر بھروسا تھا، وہ کسی چیز سے ڈرتے نہیں تھے، ہر وقت سکر کا غلبہ تھا، نماز میں ان کو لذت اور دعا میں ان کو حلاوت محسوس ہوتی تھی، اور ہر وقت ہی جنت میں لوٹتے پوٹتے رہتے تھے، دیکھنے والے دیکھتے تھے وہ دنیا میں ہیں، لیکن حقیقت میں جنت الفردوس میں تھے، اور ایک مرتبہ جوش میں آ کر کہا کہ لوگ میرا کیا لے لیں گے، مجھ سے کیا چھین کر لے جائیں گے، میرے عیش کا سامان تو میرے دل کے اندر ہے، اس کو کون نکال سکتا ہے، بعض عارفوں کا قول سنا ہے کہ خدا کہ قسم! اگر دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کس عیش میں، کس مزے میں ہیں، تو ہم کو بیٹھنے نہ دیں، تلواریں لے کر جس طرح ملکوں پر حملہ کرتے ہیں، اسی طرح ہم پر حملہ کریں اور تھوڑی سے جگہ جو ہم نے بنائی ہے، ایک گوشہ میں یا مسجد کے کونے میں، ہمیں یہاں بھی بیٹھنے نہ دیں، سمجھیں کہ یہاں کوئی خزانہ گڑا ہوا ہے، یہ جو فرش پر بچھا کر بیٹھا ہے، اتنا مگن ہے کہ اس کو نہ بھوک معلوم ہوتی ہے اور نہ پیاس معلوم ہوتی ہے، اس کی جائے نماز کے نیچے ایک سوتا ہے، کنکشن ہے، جہاں سے رزق ملتا ہے، جہاں سے فرحت ابلتی ہے، تو وہ ہمیں اٹھا دیں اس مصلے سے، اور ہم سے کہیں کہ جنگل کی راہ لو اور بیٹھ کر وہاں کھدائی کریں جیسے پٹرول کی کھدائی ہوتی ہے۔

قناعت کا جوہر

حضرات! اصل چیز کا مقابلہ وہ علماء کر سکتے ہیں، جن کے اندر قناعت کا جوہر ہو، جو کسی دام میں نہ تو آ سکیں اور کہیں ؎

بردایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جاؤ کسی اور کو آزماؤ، ہم بکنے والے نہیں ہیں، ہم سکوں کے عوض یا تمہارے عہدوں کے

عوض، کرسی کے عوض یا عزت کے عوض ہم اپنا ضمیر بیچ ڈالیں، اپنا سکون قلب بیچ ڈالیں، یہ نہیں ہوگا، اس کی امید نہ کرو، چنانچہ آپ عارفین کو دیکھیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کو بادشاہ دہلی نے پیغام دیا کہ حضرت مجھے کبھی خدمت کا موقع نہیں دیتے، کبھی تو خدمت کا موقع دیں، کبھی تو فرمائش کریں، اور ہزار روپے کی رقم پیش کرنی چاہی، تو فرمایا کہ دیکھیے! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ اس دنیا میں سے ایک براعظم ایشیا ہے، اور اس میں سے ایک ملک ہندوستان ہے، ہندوستان میں سے تھوڑا سا بچا کھچا آپ کے پاس ہے، اب اگر اس میں بھی کمی کردوں، جو تھوڑا سا رہ گیا ہے، اس میں بھی حصہ بتاؤں، یہ میں نہیں کرسکتا، تو انہوں نے بالکل دل سے یہ بات کہی تھی، واقعات تو بہت ہیں۔

برہان پور میں ایک بزرگ تھے، ان کے پاس عالمگیر نے جانا شروع کیا، وہ فرمانے لگے کہ ایک جگہ میں نے اپنے لیے انتخاب کی تھی، اگر بادشاہ کو وہ بھی پسند آگئی ہے تو میں کہیں اور چلا جاؤں۔ افسوس ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان کے اتباعِ شریعت کا جذبہ، اتباعِ سنت کا جذبہ، ان کی شب بیداری، ان کا قرآن وحدیث سے شغف، یہ سب چیزیں تو بالکل منفی ہوگئیں، ان کا ذکر نہیں آتا، بقول مصنفِ ''تاریخ گجرات'' (مولانا حکیم سید عبدالحیؒ) جس بزرگ کی سوانح پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت توڑنے کے سوا اُن کا کوئی محبوب مشغلہ نہیں تھا، اور وہ عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر ہر وقت اپنی حکومت ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کو مارا، اس کو گرایا، اگر مرا ہوا ہے تو زندہ کردیا، اگر زندہ ہے تو ماردیا، کشتی ڈوب گئی تو اس کو انگلیوں کے اشارے سے نکال دیا، ان بزرگوں کی تاریخیں بڑے غلط طریقے سے لکھی گئی ہیں، یہ حضرات درحقیقت بڑے اہل علم تھے، ہوسکتا ہے، بعض حضرات سے حدیث کے صحیح نہ پہنچنے یا حدیث کے علم کی کمی کی وجہ سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوگئی ہوں جن کی حدیث سے تائید نہیں ہوتی، لیکن عام طور سے یہ حضرات بڑے اہل علم تھے، اور علم کے بغیر کسی کو مسند ارشاد پر بٹھا نہیں سکتے تھے۔

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.﴾ [سورة الجمعة:۲] یہ

ہیں نبوت کے چار شعبے، جو اللہ تعالیٰ ان کے نائبین کو بطریق نیابت، بطریق خلافت عطا فرماتا ہے، ایک تو ہے تلاوت قرآن جس کا آپ نے نمونہ دیکھا، کئی قاریوں نے پڑھ کر سنایا، اور ہر جلسے میں سنانے کا رواج ہے، اور ہر مدرسے میں حفظ و تجوید کا انتظام ہے، اور یہ سلسلہ انشاء اللہ تا قیامت رہے گا، ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. ﴾[سورة الحجر:۹] ، اس کے بعد بعض آیتوں میں آتا ہے: ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾[سورة البقرة: ۱۲۹]، تعلیم کتاب و حکمت کو مقدم کیا ہے، اور یہ سیاق و سباق کے مطابق ہے، یہ بڑے اہل نظر کا کام ہے، وہ بتائے گا کہ یہاں کیوں مقدم کیا ہے؟ اور یہاں کیوں موخر کیا ہے؟ کیا ماحول ہے؟ سورہ کا مرکزی نکتہ کیا ہے؟ یہ تو کام کرنے کا ہے، کتاب کی تعلیم یہ علوم دینیہ ہیں، قرآن و حدیث ہیں، تفسیر ہے۔

حکمت سے مراد اخلاق

حکمت سے مراد اخلاق فاضلہ ہیں، جیسا کہ ہمارے استاذ اور اپنے زمانے کے محقق مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے کہ حکمت کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں آیا ہے، اس سے مراد اخلاق ہے ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾[سورة لقمان:۱۲] ، اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ اخلاق ہی اخلاق ہے، پہلے حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے، پھر اس کی جو انواع بیان کی ہیں، وہ سب اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، سورہ اسراء میں سارے اخلاق بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ أَوْحٰٓى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾[سورة الإسراء:۳۹]

"اے پیغمبر! یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں"، یہاں اخلاق فاضلہ بیان کرنے کے بعد حکمت کا لفظ استعمال ہوا، معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد اخلاق ہے، اخلاقِ فاضلہ۔

تزکیہ کے بغیر تعلیمِ کتاب و حکمت ناقص

اس کے بعد نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اخلاقِ رذیلہ کو نکال دیتا ہے، حسد کو، قہر کو دور کرتا ہے،

حب دنیا اور حب جاہ کو نکالتا ہے، اس کے بجائے اللہ کی محبت، آخرت کا، جنت کا شوق دل میں بٹھاتا ہے، کوئی بھی جامعہ یا دارالعلوم ہو، اس کا مقصد ان فضلاء کو تیار کرنا ہے جو تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ چاروں شعبوں میں انبیائے کرامؑ کی نیابت کا حق ادا کر سکیں، تلاوت وحکمت ناقص رہے گی جب تک کہ تزکیہ اس کے ساتھ نہ ہو، یعنی ہمارے علماء نفس کی غلامی کے پھندے سے نکل چکے ہوں، ان کو دولت اور عزت کی بڑی سے بڑی مقدار، اپنے اصولوں سے، اپنی دعوت سے، اپنے معیار سے، اپنی تعلیم سے، اپنی زندگی کے نہج سے نہ ہٹا سکے۔

آج عرب وعجم میں کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اگر کمی ہے، تو زاہدانہ زندگی اور قناعت کی، آدمی وہاں جھکتا ہے جہاں وہ چیز اس کو ملے جو اس کے پاس نہ ہو، یہ قاعدہ ہے، میرے پاس اگر کوئی چیز نہیں ہے تو میں مرعوب ہوں گا، لیکن میرے پاس اگر انیس بیس کے فرق کے ساتھ وہ چیز تو موجود ہے تو میں مار نہیں کھاؤں گا، میں سر نہیں جھکاؤں گا، تو اب جو لوگ مادیت پرست ہیں، مادیت کے زخم خوردہ ہیں، یہ جب علماء کے پاس جاتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ کسی چیز میں بھی یہ ہم سے کم نہیں ہیں، اور پھر ان کے گھروں کا نقشہ دیکھتے ہیں، اور ان کے گھروں کی زندگی اور معاشرت دیکھتے ہیں، معیار زندگی دیکھتے ہیں، تو متاثر ہونے کے بجائے ان کی بداعتقادی بڑھ جاتی ہے، آج پاکستان میں وہ علماء تیار ہوں جو ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. ﴾ پر عامل ہوں، جو نبوی وراثت کے حامل ہوں: ''إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَاراً وَّلَا دِرْهَماً، إِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ''[1] عصرِ حاضر کا چیلنج ہے مادیت، اور اس کا جواب ہے مادیت سے بالاتری، مادیت کی سطح سے بلند ہونا اور یہ ثابت کرنا کہ مادیت ہم کو متاثر نہیں کرسکتی، اور ہم مادیت کے غلام نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم طیبات کو اپنے اوپر حرام کرلیں ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ [سورة الأعراف: ۳۲] ، ﴿يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ [سورة التحريم: ۱] ، جب حضور (ﷺ) سے کہہ دیا گیا تو ہم کس شمار میں ہیں، ہم مباحات سے پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اللہ کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اگر

(۱) أخرجه ابن ماجه في سننه، كتاب السنة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، حديث رقم: ۲۲۳

لذیذ کھانا کھا سکتے ہیں تو خواہ مخواہ اس کو بے لذت نہ بنائیں، جیسے بعض بعض غالی صوفیوں کے متعلق سنا کہ سالن میں پانی اوپر سے ڈال دیا تا کہ بے مزہ ہو جائے، پڑوسیوں میں تقسیم کرنے کے لیے نہیں بلکہ بے لذت بنانے کے لیے، یا بہت سا نمک ڈال دیا، یا بے نمک کے کھا رہے ہیں، تا کہ کوئی لذت حاصل نہ ہو، یہ تزکیہ اسلام کا تزکیہ نہیں، شریعت اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی، آپ کو اگر متوسط درجہ کا خوش ذائقہ کھانا میسر ہے تو ضرور اللہ کا شکر ادا کریں، اور ہر ہر لقمہ پر شکر کریں، لیکن ہوس ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ یہ جو آج ہر طبقہ میں آگئی ہے، سرمایہ کی کوئی مقدار، عزت کی کوئی مقدار اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اور ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کا نعرہ بلند ہوتا ہے، علماء اس سے بالکل ممتاز، متمیز اور نمایاں ہوں۔

چند بوریہ نشینوں کی ضرورت

آج پاکستان کو بچانے کے لیے جہاں اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، جن کو کراچی سے اسلام آباد تک اور اسلام آباد سے فیصل آباد تک کہتا چلا آرہا ہوں، ان میں ایک بڑا عنصر اور ایک بہت بڑی طاقت علماء کی زاہدانہ قناعت والی اور خودداری والی زندگی ہے، علماء ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور ہی طبقہ کے لوگ ہیں، یہ وراثت انبیاء کے وارث ہیں، یہ نائبین انبیاء ہیں، یہ مادیت کے زخم خوردہ اور اس کے قتیل وشہید نہیں، جن کے پاس جا کر دنیا کی بے حقیقتی ظاہر ہو، اور کم سے کم یہ معلوم ہو کہ دولت ہی سب کچھ نہیں، جس کو سو بار غرض ہو وہ یہاں آئے، ہم کسی کے دروازے پر نہیں جاتے، اگر جاتے ہیں تو دین کی دعوت لے کر جائیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جائیں گے، کسی فریضہ، کسی سنت کے احیاء کے لیے جائیں گے، اپنی غرض کے لیے، کسی کی سفارش کے لیے نہیں جائیں گے۔

اس خلا کو کوئی چیز پُر نہیں کرسکتی

یہ پاکستان کی شدید ترین ضرورت ہے، اس خلا کو کوئی اور چیز پُر نہیں کرسکتی، تصنیف، تالیف، خطابت، تحقیق، سیاست، سحر بیانی کوئی چیز اس کمی کو پر نہیں کرسکتی، یہاں کچھ آدمی ایسے چاہئیں جن کے پاس طاقت والے، سیاست والے آنے پر مجبور ہوں، اور اپنے دردِ دل

کی دوا پائیں، اوران کو محسوس ہو کہ خاصان خدا کیسے ہوتے ہیں، ہم بالکل بے حقیقت انسان معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ کہا تھا، کہ تزکیہ واحسان کی اگر آپ کے نزدیک ضرورت نہیں، تو اس کی جگہ پر کوئی چیز ایسی ہو جو وہ کام کرے جو وہ کرتی رہی ہے، یعنی جہاں آ کر لوگوں کو اپنے اخلاق کی خرابی کا احساس ہو، اپنی انسانی پستی، اندرونی بیماری کا کچھ احساس ہو، جہاں آ کر ایک نئی طاقت، ایک نئی روح آدمی کو حاصل ہو، میں نے عربی شاعر حُطَیہ کہ اس شعر پر اس مضمون کو ختم کیا تھا۔

أَقِلُّوا عَلَيْهِمْ لَاأَبَالِأَبِيْكُمْ
مِنَ اللَّوْمِ أَوْ سُدُّوْا الْمَكَانَ الَّذِيْ سَدُّوْا

''بس بہت ملامت ہو چکی، ان کو تم نے بہت مٹی میں ملایا اور بہت ذلیل کیا، اب ملامت کم کرو، اس جگہ کو بھرو جس جگہ کو انہوں نے بھر رکھا تھا۔''

آپ ایک ڈاکٹر کا شفا خانہ بند کرتے ہیں، تو خدا کے لیے کوئی دوسرا شفا خانہ اس سے بہتر تو قائم کیجیے، شفا خانہ تو آپ نے بند کر دیا اور کوئی دوسرا شفا خانہ قائم نہیں کیا، اوراس کے بجائے آپ نے سبیل لگا دی، اس کے بجائے آپ نے کتب خانہ کھول دیا، کتب خانہ بہت مبارک، لیکن وہ شفا خانہ کی جگہ نہیں لے سکتا، شفا خانہ کی جگہ شفا خانہ ہی لے سکتا ہے، طبیب کی جگہ طبیب ہی لے سکتا ہے، اس زمانے کا چیلنج ہے مادیت، اوراس کا جواب حقیقی، صحیح، شرعی، مسنون روحانیت، تزکیۂ نفس، جس میں کوئی چیز خلاف شریعت نہ ہو، کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی نظیر کتاب وسنت میں اور عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نہ مل سکے، ایک طرف تو وہ راسخ فی العلم ہوں اور ایک طرف راسخ فی الدین ہوں، بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس راستہ پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (۱)

---

(۱) جامعہ تعلیمات اسلامیہ، فیصل آباد (پاکستان) میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے ۲۳ رجولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی ایک اہم تقریر، ماخوذ از ''دعوت فکر وعمل'' (صفحہ ۱۶۴ تا ۱۸۰)۔

عصر حاضر کا جدید چیلنج

اور علماء و اہل مدارس کی ذمہ داریاں

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيدالمرسلين و خاتم النبيين محمد و آله و صحبه أجمعين، و من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين.

یہ ناچیز اپنے اور اپنے رفقائے کار کی طرف سے حضرات ارکان انتظامی کا، جو اپنا قیمتی وقت نکال کر اور سفر کی زحمت برداشت کر کے اس مجلس انتظامی میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، خیر مقدم کرتا ہے، اس چیدہ اور ممتاز و منتخب مجمع کو دیکھ کر آپ سے اجازت چاہوں گا کہ ادارہ کے انتظامی امور اور مشورہ اور فیصلہ طلب انتظامی و تعلیمی معاملات کے محدود دائرہ سے ذرا ہٹ کر ان حقائق اور حالات کی طرف بھی اشارہ کروں اور آپ کی توجہ منعطف کراؤں جو اس ادارہ کے گرد و پیش اور محل و مقام نہیں، ملک و ملت کو بھی درپیش ہیں، اور ان سب پر اثر انداز، اور کوئی ادارہ، تحریک، تنظیم اور کوئی اکائی (Unit) یا معاشرہ (Society) حتی کہ دین و ملت بھی ان خارجی اثرات، عوامل و طاقات، خطرات وتحدیات (Challanges) سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔

اسلام کے قلعے

حضرات! ہمارے اسلاف کرام اور اپنے وقت کے علمائے عظام نے دین کی تعلیم کے

جو ادارے (مدارس دینیہ عربیہ) قائم کیے تھے، وہ دراصل اپنے اپنے وقت پر اور اپنی اپنی جگہ پر اسلام کے قلعے تھے، اور ان کو انہیں لفظوں اور اسی تعبیر سے یاد کرنا چاہیے۔(۱)

دین کے ایک نقطے سے بھی دستبردار نہیں ہونا ہے

ان بالغ نظر اور موفق من اللہ بانیان ومؤسسین مدارس نے (جن میں سرفہرست اور نمایاں تر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ہیں) اپنی پیش بینی بلکہ فراست ایمانی، اپنے راسخ علم اور گہرے مطالعہ، قوت مشاہدہ اور قیاس واستنتاج کی وہبی صلاحیت سے اپنے ملک ومقام بلکہ گردوپیش کی دنیا اور رواں دواں زمانے اور تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ صرف انقلاب سلطنت بلکہ تمدن وتہذیب، تعلیم وثقافت کی تبدیلی اور سیاسی واقتصادی عوامل کے اثر سے ملت کی نئی نسل کو ذہنی وفکری ارتداد بلکہ (خاکم بدہن) دینی وایمانی ارتداد، انحراف ہی نہیں بلکہ تحریف، اور دینی حمیت ہی نہیں بلکہ دین وملت سے انتساب تک سے تبری اور شرمندگی، بلکہ جہر واعلان سے بچانے کے لیے ایسے مراکز کی ضرورت ہے جہاں علم راسخ اور ایمان راسخ، بلکہ ان پر فخر وشکر، اور دین پر ثبات واستقامت ہی نہیں بلکہ ان کی اعلانیہ دعوت وتبلیغ کا مزاج پیدا ہو، اور جہاں ملی تشخص اور شریعت پر (عقائد واصول سے لے کر تہذیب ومعاشرت اور عائلی زندگی وقانون تک) ان میں استقامت ہی نہیں بلکہ غیرت وحمیت اور فخر وشکر ہو، اور وہ دین کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں۔

ایک تاریخی حقیقت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا تعلق کسی جماعتی عصبیت اور تعلی سے نہیں کہ ان

(۱) نامناسب نہ ہوگا اگر یہ ذکر کر دیا جائے کہ ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ ''الندوہ'' کے دورِ سوم میں جو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت اور حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا تھا، اس عاجز کے قلم سے اسی عنوان ''اسلام کے قلعے'' پر ایک سلسلہ مضامین شروع ہوا تھا، جو متعدد اقساط میں آیا تھا۔

فضلائے مدارس نے یہ فرض (علی حسب مراتب وتوفیق) کامیابی سے انجام دیا، اوران کی وجہ سے ابھی تک اس برصغیر ہند میں بڑی حد تک ملی تشخص اور اعتقادی، فکری، تہذیبی اوراخلاقی امتیاز پایا جاتا ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ ایک بڑے دائرہ میں اس کے عقائد محفوظ ہیں، دین کے فرائض وارکان زندہ ہیں، مسجدیں آباد ہیں، اور مرکز اسلام جزیرۃ العرب اورحجاز مقدس سے حج وعمرہ کے ذریعہ، محبت وعقیدت کے ذریعہ (اورایک خاص دائرہ میں) عربی زبان اورعلوم دینیہ کے ذریعہ ربط قائم ہے۔

ان دینی قائدین، اہل غیرت وحمیت مسلمانوں اورعلماء ودینی رہنماؤں نے اپنے اس دینی جذبہ، ملی غیرت، اور دینی فراست اور پیش بینی کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے عالم اسلام کے وسیع دائرہ میں بھی کام لیا، اس سلسلہ میں تحریک خلافت، ترکوں کی حمایت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کی حفاظت تک ان کی سعی، دلچسپی اورسرگرمی محدود نہیں تھی، اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی تاریخ بہت کچھ محفوظ ہے، اور جو حضرات یہاں تشریف رکھتے ہیں ان میں سے بہت سے اس کے شاہد عینی اورمعاصر رہ چکے ہیں، اور بہت سے حضرات نے اس کو علی سبیل التواتر سنا ہے اور وہ اس کی طاقت وہمہ گیری سے واقف ہیں۔

علمی حملوں کا علمی جواب

لیکن یہ بات بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ نہیں ہوگی کہ ہندوستان کے علماء اور مدارس کے فضلاء نے علمی وفکری اور تصنیفی طور پر بھی ہندوستان اور بیرون ہند میں اٹھنے والے صلیبی حملوں اور تشکیکی وانتشار انگیز لٹریچر کا ایسا مقابلہ کیا جس کا خالص مسلمان اکثریت کے ملکوں اورعلمی ودینی مرکزوں میں بھی، جہاں صدیوں کی پرانی اور عالمگیر شہرت رکھنے والی جامعات اور تصنیفی مراکز قائم ہیں، اعتراف کیا گیا، اس سلسلے میں ہم ان نادرۂ روزگار تصنیفات کا ذکر نہیں کریں گے، جو ہندوستان کے اسلامی عہد میں وجود میں آئیں اور

فضلائے عرب بلکہ ائمۂ فن نے بھی ان کی انفرادیت اور بے نظیری کا اعتراف کیا۔[۱]

ان میں ایک حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء) کی بے نظیر کتاب ''اظہار الحق''[۲] ہے، جس میں اناجیل اور مذہب عیسوی پر ایسی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے جو ریاضی کے نتائج کی طرح (کہ دو دو چار ہی ہوتے ہیں اور چار چار آٹھ ہی ہوتے ہیں) اناجیل کے بیانات میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے، جن کا جواب ابھی تک مسیحی دنیا اور کلیسا کے فضلاء نہیں دے سکے، راقم نے خود انگلستان سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار میں پڑھا کہ ''جب تک اس کتاب کی طبع و اشاعت کا کام جاری رہے گا عیسائیت کی تبلیغ نہیں ہو سکے گی''۔

دوسرا کارنامہ مولانا شبلی نعمانی کا ہے کہ جب مشہور مصری مسیحی فاضل مورخ و ادیب جرجی زیدان کی کتاب ''تاریخ التمدن الإسلامي'' نکلی، جس میں اسلامی تمدن پر ایسے محتاط اور سلیقہ مندانہ طریقہ پر حملے کیے گئے تھے جن سے پڑھنے والوں کا ذہن اسلام کے دین حق ہونے اور زندگی کا بہترین ڈھانچہ دینے کی صلاحیت سے محروم نظر آنے لگتا ہے، مولانا شبلی علیہ الرحمۃ نے اس کا بڑی قابلیت اور سلیقہ مندی سے جواب دیا اور کتاب ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الإسلامي'' کے نام سے شائع ہوئی، جس کی داد فضلائے عرب حتی کہ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے بھی دی۔

تقابلی مطالعہ

ان مدافعانہ اور جوابی علمی کوششوں کے علاوہ ہندوستان کے فضلاء اور محققین کے اور متعدد علمی کارنامے اور تحقیقی و تقابلی مطالعہ کے نمونے ہیں جن کی مثال عالم عربی میں بھی ملنی

---

(۱) اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم مولانا سید عبدالحئیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی منفرد کتاب ''الثقافة الإسلامية في الهند'' مطبوعہ المجمع العلمي العربي، دمشق

(۲) یہ کتاب جب لکھی گئی اس وقت نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ عرب ممالک پر بھی مشنریوں کے حملے اور مسیحیت کی دعوت شروع ہو گئی تھی اور سلطنت ترکی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی، اس سلسلے میں پادری فنڈر بہت زیادہ سرگرم اور فعال تھا

مشکل ہے، ہم یہاں پر چند کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں:-

مولانا شبلی کی ''الجزیۃ فی الاسلام'' مولانا سید سلیمان ندوی کی ''خطبات مدراس'' اور ''أرض القرآن''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی اردو ترجمہ اور تفسیر، جن میں جدید ترین معلومات وتحقیقات کی روشنی میں قرآن کا اعجاز اور صحف سماویہ پر تفوق ثابت کیا گیا ہے، ایسے ہی ان کی کتاب ''مشکلات القرآن''، مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' وغیرہ۔

مسلم ممالک میں الحاد ولادینیت کا مقابلہ

اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ علمائے ہند وفضلائے مدارس نے کبھی بیرونی اسلامی ممالک سے آنکھیں بند نہیں کیں، وہاں اٹھنے والے فتنوں، تشکیکی حملوں اور الحاد ولادینیت اور ''قومیت عربیہ'' کی خطرناک اور بعید نتائج رکھنے والی مخالف اسلام دعوت کو نظر انداز نہیں کیا، اس سلسلے میں (معذرت کے ساتھ) لیکن اضطراراً اور ضرورتاً یہ عرض کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور فضلاء نے ہمیشہ ان بیرونی فتنوں کا نوٹس لیا، جو مرکز اسلام میں ارتیاب اور تزلزل پیدا کرنے والے بلکہ نصرانیت، یہودیت، اور لادینیت کے لیے راستہ کھولنے والے تھے،[1] اس سلسلے میں ندوہ سے نکلنے والے رسالے ''البعث الإسلامي'' اور ''الرائد'' کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جن سے سلیم الطبع، اسلام پسند عرب بڑے متاثر ہوئے ہیں، پھر مرحوم عزیز القدر محمد الحسنی کے رسائل اور کتابیں جن میں ''الإسلام الممتحن'' اور ''الإسلام بین لا و نعم'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں سے بعض کتابوں کو پڑھتے ہوئے راقم نے بعض عرب فضلاء اور قائدین کو اشکبار اور تردیدہ دیکھا ہے، اسی مقصد کے لیے مئی ۱۹۵۹ء میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' دارالعلوم کے احاطہ میں قائم ہوئی، اور اس نے عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں وہ لٹریچر شائع کیا جو بہت مؤثر اور اسلام کے بارے میں غیر مسلموں تک کے دل میں وقعت واحترام

(۱) تفصیل اور دلائل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟'' شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پیدا کرنے والا ثابت ہوا، ابھی حال میں خاکسار نے ان دعوتی رسائل وخطبات کا جائزہ لیا جو عربی میں لکھے گئے تھے، تو ان کی تعداد بہتر (۷۲) نکلی، جن میں بہت سے ممالک عربیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں، اور شوق سے پڑھے گئے ہیں۔

اسلام کے خلاف یہودی ومسیحی سازشیں

اب اس تاریخی جائزہ اور علمائے ہند اور فضلائے مدارس کی وسیع ذمہ داریوں اور کوششوں کے پس منظر اور روشنی میں مقتدر اراکین کی خدمت میں ان چند الحادی وارتدادی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مغرب میں اسلامی ممالک کو عمومیت کے ساتھ اور ممالک عربیہ کو (جن کو قیامت تک لیے دین کا منبع اور ماوی بنایا گیا ہے) نہ صرف اسلامی ودینی حمیت وعزت سے محروم کرنے بلکہ اسلام سے انتساب تک کے منکر ہونے اور اس کی تحقیر وتذلیل کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے شروع کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی حقیقت کا (جو انکشاف کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ اب مشاہدہ اور حد تواتر تک پہنچ گئی ہے) ذکر کیا جاتا ہے، وَفِي ذٰلِكَ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَبْصَارِ۔

واقعہ یہ ہے کہ یہودی دماغ اور ذکاوت (جس کو عربی میں شطارت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور مسیحی طاقت واقتدار اور وسائل اثرات، دونوں اس وقت اسلام کی بیخ کنی اور اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹی پانے کی کوشش میں ہمنوا اور دمساز بن گئے ہیں۔ (۱)

یہودی صدیوں پہلے سے دنیا کو شطرنج کی ایک ایسی بساط بنانا چاہتے ہیں جو بالکل ان کے قابو میں ہو اور جس مہرہ کو چاہیں وہ کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ سکیں، اور ان کی کتابوں صحف تلمود اور "بروتوکولات حکماء صیھون" میں اس کی تصریحات موجود ہیں، اور وہ اس مقصد کو اخلاقی پستی، بے ضمیری اور نفس پرستی پیدا کر کے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم کر کے اب مشترک ومتحد طریقہ پر اس مقصد کے حصول میں شریک ہیں، یہاں پر صرف ایک امریکی

(۱) اس موضوع پر راقم نے ۳ ر ستمبر ۱۹۹۴ء کو مکہ معظمہ میں رابطۂ عالم اسلامی کے ایک موقر نمائندہ جلسہ میں ایک مقالہ پڑھا تھا، جو قابل ملاحظہ ہے۔

فاضل ہمویل زویمر (Zwemer) (۱۹۵۲ء) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو ان کی اس تقریر سے ماخوذ ہے جو مسیحی مبلغین کی کانفرنس میں انہوں نے کی تھی:

''ہر میدان عمل میں ہماری سرگرمیاں ایسی ہونی چاہئیں کہ جن کا اصل نشانہ نوخیز مسلم نسل ہو اور جو مسلمانوں کے باہمی روابط میں انتشار پیدا کردے، تاکہ ان کارروائیوں کے شکنجہ میں مسلمان جکڑ کر رہ جائیں، اور ہماری یہ کوششیں انہیں لخت لخت اور پارہ پارہ کردیں؛ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں اس عمل کو دیگر امور پر مقدم رکھا جائے، کیوں کہ اس نسل جدید کے سینوں میں اسلام کی روح پیدا ہوگئی تو اسلام ایک بار پھر اپنے عنفوان شباب کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوگا، لہٰذا اس نازک صورت حال میں ضروری ہے کہ نوخیز مسلم نسل کو اس کے نقطۂ اعتقاد و ارتکاز سے بعید و بے گانہ بنادیا جائے، قبل اس کے کہ اس کی عقلی و فکری بالیدگی تکمیل کے مرحلہ میں داخل ہو۔''(۱)

عالم اسلام وممالک عربیہ کی صورت حال

حضرات! ان کوششوں کے نتائج ترقی یافتہ ممالک عربیہ میں ظاہر ہوگئے ہیں، اور آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں، ان کا اولین اثر یہ ہے کہ دین کی حمیت اور اسلام پر افتخار جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کمزور و نادر اور صاحب اقتدار طبقہ میں معدوم و مفقود ہے، لادینیت، تشکک وارتیاب، مغربی تہذیب واقتدار سے تنفر اور جذبۂ جہاد اور شوق شہادت تو بڑی چیزیں ہیں، ان عرب ملکوں میں تو اب ان چیزوں سے استنکاف اور مغربی تہذیب واقتدار سے بیزاری اور ان سے آزاد ہونے کی سعی وجد وجہد بھی ختم ہوتی جارہی ہے، حکومت کا رخ آزادی و نامذہبیت (Secularism) کی طرف ہوتا جارہا ہے، قرآن مجید کا اعجاز تھا کہ اس نے سورہ فاتحہ ہی میں جو ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے، شدید اعتقادی تناقض وتضاد کے باوجود (جو یہودیوں اور عیسائیوں میں پایا جاتا ہے) دونوں کا نام ساتھ لیا ہے اور دونوں کے اثر سے بچنے کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾۔

(۱) ترجمہ ماخوذ از مقالہ مولوی سید محمد واضح رشید ندوی، مطبوعہ ''تعمیر حیات'' ۱۰ر جولائی ۱۹۹۵ء

بعض عرب ملکوں میں جن میں (تونس والجزائر پیش پیش ہیں) دین اور اہل دین سے کھلی محاذ آرائی، اور دوسرے ترقی یافتہ عرب ملکوں میں صاحب اقتدار طبقے اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایسے حالات دیکھنے میں اور ایسے اقوال سننے میں آنے لگے ہیں جن سے پیشانی پر پسینہ ہی نہیں، آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، ابھی حال میں دارالعلوم کے ایک استاد[1] ایک تعلیمی اجلاس رابطة الجامعات الاسلامية کے جلسہ میں شرکت کے لیے راقم کے نمائندہ بن کر گئے تھے، انہوں نے اپنے سفر کی جو روداد پیش کی ہے[2] اس کو پڑھ کر، خاص طور پر جو مصر کی تاریخ سے واقف ہے یا وہاں جا چکا اور کچھ عرصہ رہ چکا ہے، اندوہگین اور لرزہ براندام ہو جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں اور دوسرے عرب ملکوں میں بھی اس کا ردعمل پایا جاتا ہے، اسلامی اور دعوتی کتابیں کثرت سے مقبول ہو رہی ہیں، انبیاء کے قصص کی کتاب گھروں میں کثرت سے پڑھائی جاتی ہے، اور سب کے پیش نظر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے، البتہ دعوتی جدوجہد، فکری انقلاب کی کوشش، اور اسلام کی ابدیت اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت پر اعتماد پیدا کرنے کے لیے علمی و دعوتی لٹریچر پیدا کرنے اور پھیلانے کی ضروت ہے۔

فضلائے مدارس کے کرنے کے کام

اس صورت حال کو جو سخت دل خراش اور باعث شرم ہے، اتنی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ ہمارے مدارس عربیہ میں، جس کے متعدد ذمہ دار اور سرپرست یہاں موجود ہیں، عربی زبان کی تعلیم کو اس معیار پر پہنچانے کی ضرورت ہے کہ ممالک عربیہ اور ترقی یافتہ اسلامی ممالک میں خطابةً اور کتابةً دعوت کا کام کر سکیں اور وہ عرب نوجوانوں اور فضلائے اہل فکر و اہل قلم کو، بلکہ صاحب اختیار طبقہ کو بھی متاثر کر سکیں، ہمارے عربی مدارس کے ذمہ داروں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل کرنے کی

(۱) نذر الحفیظ ندوی ازہری

(۲) مکمل روداد کے لیے دیکھیے: ''کاروان زندگی'' حصہ ششم میں ص ۸۸ تا ۱۰۲۔

ضرورت ہے کہ اب یہ ناپسندیدہ اثرات خلیج کی ریاستوں، کویت، بحرین، وغیرہ اور کسی حد تک (خاکم بدہن) سعودی عرب میں بھی پہنچ رہے ہیں۔

دوسرا محاذ جس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے فضلاء کو تیار ہونا اور رہنا چاہیے، وہ ہندو احیائیت (Hindu Revivalism) کی زبردست تحریک ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مختصر لفظوں میں اس ملک کو اسپین بنادیا جائے، جہاں صرف نسلی حیثیت سے مسلمان رہیں، باقی ان کی تہذیب و معاشرت اور عائلی قانون، اور ہو سکے تو اعتقادی سانچہ بھی بدل دیا جائے، اور وہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر ہندو دیومالا (Hindu Mythology) کو قبول کرلیں، اس کے لیے نصاب تعلیم، ذرائع ابلاغ اور سیاسی اثرات سے بھی کام لیا جارہا ہے، اور اس کے اثرات بھی نظر آنے لگے ہیں۔

پہلے پرسنل لا میں مداخلت کے لیے اقدام کیا گیا تھا، اور بعض خلاف شرع اور منافی شرع عدالتی فیصلے کیے گئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار وفرزند مولانا سید محمد علی مونگیریؒ) کے درجے بلند فرمائے کہ انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کر کے اور ایک ہمہ گیر مہم چلا کر اس خطرہ کا فی الحال سدباب کردیا، لیکن ابھی حال میں یونیفارم سول کوڈ کا شگوفہ چھوڑا گیا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی بھی ملت اسلامیہ ہندیہ نے بالعموم اجتماعی طور پر مخالفت کی، اور امید ہے کہ انشاءاللہ وہ عمل میں نہ آسکے گا۔

ان سب حقائق، واقعات، خطرات اور انذارات کو سامنے رکھ کر آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے مدارس عربیہ دینیہ میں ان حقائق کو سامنے لانے اور مدارس کے فضلاء کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار اور سرگرم بنانے کی ضرورت ہے، ندوۃ العلماء کی (جو انھیں حقائق وخطرات کے شعور وعلم اور ان کا مقابلہ کرنے کے عزم کے نتیجہ میں وجود میں آیا) مجلس انتظامی میں جس میں منتخب وممتاز علماء ودانشور شریک ہیں، پیش کرنے کی جرأت کی گئی، جس کے لیے معافی بھی چاہی جاتی ہے اور توجہ وحسن استماع کا شکریہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

وما النصر إلا من عند الله. (۱)

(۱) ۱۶ر صفر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۶ر جولائی ۱۹۹۵ء کو ندوۃ العلماء کے ارکان انتظامی کے جلسہ میں پیش کی گئی رپورٹ، ماخوذ از پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر جولائی ۱۹۹۵ء)۔

پیامِ راہ

حضرات اساتذہ، حاضرین مجلس وعزیز بھائیو!

جامعہ اسلامیہ میرے لیے کوئی نیا ادارہ نہیں ہے، میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں آیا، شروع سے اس کے مشوروں میں شریک رہا ہوں، اور پہلا سفر بھی اسی سلسلہ میں ہوا تھا، ہمارے عزیز اور ہمارے دوست محی الدین صاحب منیریؔ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے میں شروع سے اس کام میں ذہنی طور پر قلبی طور پر شریک رہا، اور اس دوسری مرتبہ کی حاضری میں بھی اس کے معائنہ سے اور آپ لوگوں کی ملاقات سے محروم نہیں رہا، آپ سب جانتے ہیں کہ یہ کوئی وعظ کا جلسہ نہیں ہے، مجھے، جب سے آیا ہوں، کئی بار اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنے کا موقع ملا اور ایک دو بار شاید اور موقع ملے، اس وقت اور باتیں بھی ہوں گی، لیکن اس وقت عام باتیں کہی جائیں گی، یہاں مجھ سے یہ امید کی جاتی ہے بجا طور پر کہ میں اس وقت اپنے اس جامعہ کے مدرسین، اساتذہ اور یہاں کے طلبہ سے کچھ کہوں، اور میرے لیے یہ بات آسان بھی ہے اور خوشگوار بھی، اس لیے کہ میں خود بھی ایک مدرسہ کا پڑھا ہوا ہوں، اور ایک مدرسہ میں عرصہ تک میں نے پڑھایا ہے، اور میری زندگی ایک مدرس کی زندگی ہے، اس لیے مجھے آپ لوگوں سے بات کرنے میں کوئی تکلف نہ کرنا پڑے گا، کوئی بہت دور کی کوڑی لانی نہیں پڑے گی، بہت زیادہ دماغ پر زور دینا نہیں پڑے گا۔

امیدوں کا مرکز

بھائیو! تم لوگ بہت سی امیدوں کا مرکز ہو، اور یہاں کے مسلمانوں نے اور تمہارے سرپرستوں نے اور اس جامعہ کے کارکنوں اور اس جامعہ کے سرپرستوں نے تم سے بہت سی

اُمیدیں قائم کی ہیں، اور ایسا کرنا بھی چاہیے تھا، اس لیے کہ مسلمان خواہ کچھ بھی ہو جائیں، بہت بڑے تاجر، بہت بڑے کاروباری، بہت بڑے دولت مند، سرمایہ دار اور حکومت میں شریک ہو جائیں، اور ملک کی ذمہ داری میں بھی ان کا بڑا حصہ ہو جائے، جب بھی مسلمانوں کو بہر حال دینی رہنماؤں کی ضرورت ہوگی، حرام و حلال، کفر و ایمان، جائز و ناجائز، اور دین اور لادینیت کے درمیان لکیر کھینچنے والوں کی ضرورت ہوگی، جو لکیر کھینچ کر بتاسکیں کہ یہ کفر ہے، یہ ایمان ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، یہ دین ہے، یہ لادینیت ہے، یہ اسلام ہے، یہ جاہلیت ہے، مسلمان کسی دور میں اور کسی ملک میں، کسی حال میں بھی ایسی جماعت سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

کوئی گروہ رہنمائی کے بغیر اپنا سفر طے نہیں کر سکتا

سمجھا یہ جاتا ہے کہ تم ان لوگوں کی جگہ لوگے جن کا فرض رہنمائی ہے، مسلمانوں کی رہنمائی کا لفظ بہت بڑا ہے، لیکن بہر حال ہر جماعت کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی گلہ جانوروں کا ہو اور کوئی گروہ انسانوں کا ہو، رہنمائی کے بغیر اپنا سفر طے نہیں کر سکتا، اپنی منزل مقصود کو پہنچ نہیں سکتا، اور کسی نظام میں باقی نہیں رہ سکتا، جس طریقے سے ہماری غذائی ضروریات ہیں، ہماری شہری ضروریات ہیں، تمدنی ضروریات ہیں، اور سیاسی ضروریات ہیں، قبلہ نما کی ضرورت، واقعہ یہ ہے کہ سب ضروریات سے زیادہ ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمیں کوئی یہ بتانے والا ہو کہ ہم ٹھیک راستہ پر چل رہے ہیں یا نہیں، "کیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است" ایسا تو نہیں ہے کہ ہم پشت بقبلہ یعنی ہماری پیٹھ قبلہ کی طرف ہو، اور ہمارا رخ بت خانہ کی طرف ہو، یا معاذ اللہ کلیسا کی طرف ہو، بینک کی طرف ہو، کہ یہ بھی ایک کلیسا ہے اس زمانے کا، یا کسی کارخانہ یا فیکٹری کی طرف ہو، آج کل کلیساؤں میں وہ رونق نہیں ہے اور مندروں میں وہ چہل پہل نہیں ہے جو بینکوں اور کاروباری مراکز میں ہے، یہ بھی زمانہ کی بہت بڑی پرستش گاہ بن گئی ہے، کوئی جماعت ایسی ہونی چاہیے جو رائے اور حکمت کے ساتھ بتائے، مہربانی اور محبت کے ساتھ بتائے، اور پھر اگر ضرورت ہو تو دامن بھی کھینچ لے، دامن پکڑ لے، اور گریبان بھی اگر پکڑنے کی ضرورت ہو تو جس طریقے سے باپ بیٹے کا گریبان

پکڑتا ہے، اور ایک پڑھا لکھا، ایک جاہل بھی گریبان پکڑتا ہے، ایک بھائی دوسرے بھائی کا گریبان تھام لیتا ہے، اسی طریقہ سے ایک ایسی جماعت کو سامنے آجانا چاہیے، راستہ روک کر کھڑا ہونا چاہیے کہ یہ راستہ خطرناک ہے، یہ اللہ سے اور اس کے رسول سے دور کرتا ہے، یہ ہلاکت ابدی میں گرادے گا، اور یہ غار کے اندر ڈال دے گا۔

مدارس کا اصل فائدہ

تو اس کے لیے ضرورت ہے مدارس کی، اور مدارس کا اصل فائدہ یہی ہے کہ ایسے لوگ تیار ہوں جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کرسکیں، اور وہ گویا جیسے قبلہ نما ہوتا ہے، اور قبلہ نما ایک بے نیاز چیز ہے، آندھی چل رہی ہو، یا پانی برس رہا ہو، گاڑی کسی رخ پر جارہی ہو، آدمی کا منھ کسی طرف ہو، لیکن قبلہ نما یا قطب نما کہہ لیجیے، وہ قطب نما، قطب تارہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے، وہ نہ کوئی رشوت قبول کرتا ہے، اور نہ کسی کی رعایت کرتا ہے، اور نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے، اور نہ اپنے کام سے تھکتا ہے، اور اس سے کسی اور کام کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے، زیادتی ہے اس کے ساتھ بھی، اپنے ساتھ بھی، نہ آپ اس سے کہیں راستہ پوچھیں، یا جیسے ٹرافک کنٹرول کرنے والا سپاہی ہوتا ہے، وہ کسی کو پانی پلانے کے لیے نہ جائے تو کوئی گناہ نہیں، وہ کسی کو راستہ بتانے کے لیے کچھ دور نہ چلے تو کوئی قصور نہیں، اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہے، بس ٹرافک کنٹرول کرتا رہے، دائیں بائیں ہاتھ اِدھر کرے اُدھر کرے، اگر وہ اپنا کام چھوڑ دے گا تو مسافر کے بھٹک جانے سے زیادہ نقصان پہنچے گا، راستہ بھول جائے تو مسافر پھر واپس آجائے گا، لیکن یہاں پر کاریں ٹکرا جائیں گی، یہاں ٹرک اور جیپ میں اور کار میں ٹکر ہو جائے گی، اور معلوم نہیں کتنے آدمی اسی وقت اسی جگہ جان توڑ دیں گے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ جگہ پر اٹل، بے نیاز، ہر دو جہاں سے غنی اور دل بے نیاز، بس ایک ہی کام ہے اس کا کہ یہ راستہ کعبہ جاتا ہے، بیت اللہ کو جاتا ہے اور یہ راستہ ترکستان کو جاتا ہے، اسی کے لیے مدارس قائم کیے گئے ہیں۔

عربی زبان کی اہمیت

اور چونکہ یہ بات خاص طرح کے علوم اور ایک خاص زبان عربی کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتی، اس لیے عربی پر زور دیا گیا، اور ان علوم کو نصاب میں رکھا گیا، ورنہ عربی ہماری زبان نہیں ہے اور ہم ہندوستانی مسلمان بہت بڑے نرغہ میں ہیں، زبانوں کے ایک ایسے چکر میں کہ شاید ہی دنیا کی کوئی قوم اس میں مبتلا ہو، یعنی ہم کو علاقائی زبان پڑھنی ہے، اور مادری زبان پڑھنی ہے، اور آپ کی مادری زبان نائطی ہے، اور آپ کی علاقائی زبان کنٹری ہے، اور آپ کی مذہبی زبان عربی ہے، اور آپ کی ہندوستان کی علمی زبان اور اخبارات اور رسائل کی زبان، تصنیف اور تالیف کی زبان اردو ہے، فارسی کا نام میں نہیں لیتا، ذرا سا اب اس کا مسئلہ دور ہو گیا ہے، یہ چار پانچ زبانیں ہیں، ایسی حالت میں عربی زبان پر زور دینا اور اور عربی کو ایسا سمجھنا جیسا کہ اہل زبان سمجھتے ہیں تا کہ آپ قرآن مجید اور کتاب وسنت کی چیزوں کو آپ اچھی طرح گہرائی سے سمجھ سکیں، اس لیے یہ مشکل کام اختیار کیا گیا کہ آپ کو جو کام کرنا ہے وہ اس کے بغیر ہو نہیں سکتا، تو اس لیے عربی زبان پر زور دینے کی ضرورت ہے، اور عربی زبان کے لیے صرف ونحو کی ضرورت ہے، اس کے لیے آپ کو محنت کی ضرورت ہے، اور عربی ہمارے لیے کوئی نئی یا نامانوس نہیں، عربی زبان ہمارے ہندوستان میں بہت بڑی زبان رہی ہے، علمی زبان اور تصنیفی زبان رہی ہے۔

آپ کو عربی سے بڑی مناسبت ہے

خود آپ کے علاقے میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے ہیں، ان کی کتابیں یہاں اہل علم کے پاس ہیں، ہمارے پرانے دوست اور ہم سبق خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی ان کے یہاں اچھا خاصا ذخیرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنّاوَر اور یہ جو ساحل کا علاقہ تھا، اس میں بڑے بڑے چوٹی کے علماء پیدا ہوئے، اور بڑی عالمانہ ہی نہیں بلکہ تحقیقانہ کتابیں لکھی ہیں کہ اہل عرب بھی ان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھیں اگر وہ چھپیں، ان لوگوں نے محنت کی تو ان کو زبان پر ایسا عبور ہو گیا جیسے زبان والوں کو ہوتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو زبان کے اخذ کرنے میں بڑی کامیابی ہوتی ہے، آپ کی زبان بہت نرم ہے، اور اردو

آپ بہت جلد سیکھ لیتے ہیں، اور آپ کی اردو بولنے میں وہ بات نہیں ہے جو ہندوستان کے بعض علاقوں کے رہنے والوں کی زبان میں، دو لفظ بولتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اہل زبان نہیں ہیں، یہ بات آپ میں نہیں ہے، آپ کی زبان میں لوچ ہے، کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتا، ماہر لسانیات جانیں، آپ کی زبان میں لوچ ہے، ایسے ہی آپ کو عربی سے بڑی مناسبت ہے، اور جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ عربی النسل ہیں، تو اس لیے بھی آپ کے عربی کے اخذ کر لینے میں اور عربی زبان میں کمال پیدا کر لینے میں کچھ دقت نہیں ہے۔

منزل آپ ہیں

بھائی! بڑی امیدوں اور توقعات کے ساتھ یہ جامعہ قائم کیا گیا، مجھے افسوس ہے کہ آج دو تین سال کے بعد میں آیا ہوں، تو مجھے جو امید تھی کہ جہاں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، وہاں بڑی بڑی اگر نہیں تو دو چار عمارتیں ضرور کھڑی ہوں گی، بھٹکل والے جہاں جایئے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعض کاروبار بالکل بھٹکلی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، کالی کٹ جایئے تو ان کے ہوٹل اور کپڑے کی دوکانیں، کولمبو جایئے تو وہاں، مدراس جایئے تو وہاں، کلکتہ جایئے تو وہاں، ایسی حالت میں تو ان کو واقعی جامعہ بنا دینا چاہیے تھا، میں نہیں سمجھ سکا کہ یہاں کیا رکاوٹ ہے، اس میں کیا جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف سے کچھ سستی اور کمزوری ہے، یہ تو مجھے کہتے ہوئے ذرا تامل ہوتا ہے، اس لیے کہ منیری صاحب کی مستعدی تو میں جانتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب بڑے مخلص آدمی ہیں، یا یہ کہ ان لوگوں کو ذوق نہیں ہے، بہر حال جو وجہ بھی ہو، لیکن مجھے افسوس ہوا کہ اس وقت تک بھی جامعہ کو جس منزل پر دیکھنا چاہتا تھا وہ منزل ابھی دور معلوم ہوتی ہے، وہ منزل دور ہو، لیکن وہ منزل آپ ہیں، اگر آپ محنت سے پڑھیں گے اور خاص طور پر عربی زبان اور عربی اور دینی علوم میں اگر آپ یہاں رہ کر پختگی پیدا کریں گے، تو جامعہ چاہے اس کی بڑی بڑی عمارتیں نہ بن سکیں، اور وہ کوئی بڑی شہرت حاصل نہ کرے، اور اس کا کوئی وسیع رقبہ نہ ہو، اور جامعہ کی شان نظر نہ آتی ہو، تو کچھ حرج نہیں، آپ جامعہ ہیں، اگر آپ صرف ونحو میں اچھے ہیں، آپ کی استعداد پختہ ہو رہی ہے تو گویا جامعہ کامیاب ہے اور جامعہ کا کام شروع ہو گیا۔

چھوٹے مدارس کی اہمیت

ایک بات آپ کو یہ بھی بتاتا ہوں تجربہ کی کہ اب عربی مدرسے جو ہیں بڑے بڑے، ان میں ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اب طالب علموں میں وہ استعداد پیدا نہیں ہوتی، بہت خامی رہتی ہے، اس کی بڑی وجہ جو تجربہ کار لوگ ہیں یہ بیان کرتے ہیں، کہ پہلے چھوٹے مدرسے سے طالب علم آتے تھے اور اچھے ہوتے تھے، اس لیے کہ تھوڑی تعداد میں ہوتے تھے، اور ان پر ان کے استادوں کی ساری توجہ بالکل جم جاتی تھی، وہاں انتشار نہیں ہوتا تھا جیسے شہروں میں انتشار ہے، سنیما ہیں، تفریح گاہیں ہیں، پروگرام ہیں اور مختلف قسم کے Varieties ہیں، تو وہ چیزیں وہاں نہیں ہوتی تھیں، اس لیے ان کی سب توجہ پڑھنے کی طرف ہوتی تھی، اور انہیں سے طاقت ملتی تھی، خون ملتا تھا بڑے مدارس کو، یہی دیوبند کا بھی معاملہ ہے، یہی ندوہ کا بھی معاملہ ہے، اب چھوٹے مدارس میں خود کمزوری آ گئی ہے، اور یہ چھوٹا مدرسہ نہیں ہے، جامعہ ہے، یعنی میں کہتا ہوں کہ جو قصبات کے مدارس ہیں، ان میں اب طالب علم ٹکتے نہیں، ان کا جی نہیں لگتا، وہ کہتے ہیں کہ ہم کو شہر بھیجو، اپنے والدین سے کہتے ہیں اور ضد کرتے ہیں کہ ندوہ بھیجو، اس لیے کہ یہ فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، بڑے بڑے مشہور لوگوں کے ساتھ ندوی لکھا جاتا ہے، اور پھر وہ جو طالب علم آتے ہیں، قصہ بیان کرتے ہیں وہاں کے، کچھ مبالغہ کے ساتھ اور کچھ مرعوب کرنے کے لیے، ایسی عمدہ عمارتیں ہیں، اتنا بڑا کتب خانہ ہے اور بڑے بڑے لوگ وہاں آتے ہیں، اور وہاں بڑا جی لگتا ہے اور بڑی شان معلوم ہوتی ہے، وہ کچھ اپنی شان بڑھانے کے لیے کچھ شان دکھاتے ہیں، تو یہاں کے جو طالب علم ہیں، بہت سے مدرسے ہیں، سیکڑوں کی تعداد میں مدرسے ہیں، ہندوستان میں جال پھیلا ہوا ہے، اب وہاں مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ وہاں جتنے استاد اتنے طالب علم، اور بعض مدرسوں کا تو معلوم ہوا ہے کہ استاد زیادہ اور طالب علم کم، اور جو ان سے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ لڑکے یہاں رکتے ہی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم ندوہ میں کیوں نہ پڑھیں، ہم دیوبند میں کیوں نہ پڑھیں، اس لیے کہ جب واپس آئیں گے تو لوگ پوچھیں گے کہ آپ کہاں پڑھتے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ ندوہ میں پڑھتے ہیں، تو ایک فخر محسوس ہوتا ہے، یہ غلط ذہنیت ہے، آپ لوگ یہاں دل لگا کر پڑھیے

اور اس کے بعد جب آپ کے اساتذہ مناسب سمجھیں تو آپ دیوبند، ندوہ جایئے، مظاہر العلوم جایئے، کسی مدرسے میں جایئے، تو وہاں آپ ہی چمکیں گے، یہ آپ کو بتا دیتا ہوں میں کہ اگر آپ یہاں اچھی طرح پڑھ کر جائیں گے، دل لگا کر پڑھیں گے، صرف ونحو آپ کی اچھی ہوگی اور یہی کتابیں جو آپ کے نصاب میں ہیں، یہ پڑھ کر آپ وہاں جائیں گے، تو آپ ہی آپ ہوں گے، جو وہاں شروع سے پڑھ رہے ہوں گے، وہ آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکیں گے، اس لیے کہ وہاں ساٹھ ساٹھ طالب علم کو ایک استاد لے کر بیٹھتا ہے، وہ تو پہچانتا بھی نہیں، چھ چھ مہینے گزر جاتے ہیں، اپنے شاگردوں کو پہچانتا نہیں، دیوبند میں تو اس سے زیادہ ہوتا ہے، وہ جلسہ ہوتا ہے درجہ نہیں ہوتا، میں بعض مرتبہ گزرا تو استاد صاحب تقریر کر رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا یہ ایک چھوٹا سا جلسہ تھا سیرت کا، اور اس میں کوئی صاحب وعظ کہہ رہے ہیں، اور باقی طالب علم کچھ ان کے پلہ پڑ رہا ہے یا نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے، تو آپ لوگوں کے لیے پہلی بات تو یہ ہے اور سب سے زیادہ آپ کے لیے کام کی اور ضروری کہ آپ محنت کیجیے اور سمجھیے کہ یہیں آپ بنیں گے، کہیں اور کوئی جگہ آپ کو بنانے والی نہیں، آپ کو بنانے والی جگہ یہی ہے، استادوں کو پکڑ لیجیے اور ان سے خارج وقت میں بھی، یعنی مدرسے سے علاحدہ جو اوقات ہیں، ان میں بھی آپ ان سے پڑھیے، ان کے گھر جایئے۔

علم حاصل کیا جانا چاہیے

اور یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ بھئی دودھ دوہا جاتا ہے، گائے دودھ دوہ کر نہیں دیتی، تو استاد درخت کی طرح ہے، درخت کا پھل توڑا جاتا ہے، یہ نہیں کہ آدمی اس کے نیچے منھ کھول کر لیٹ جائے اور امید میں رہے کہ پھل اس میں ٹپک جائے گا، اگر ناریل ہوا اور منھ پر گرا تو چوٹ بھی لگ جائے گی، خدا بچائے، لیکن کھجور جیسی کوئی چیز ہو تو چوٹ نہیں لگے گی، ایک افیونی لیٹا ہوا تھا کھجور کے درخت کے نیچے، اور منھ کھولے ہوئے تھا، کسی نے پوچھا: منھ کیوں کھولے ہوئے ہو بھئی؟ اس نے کہا کہ ممکن ہے ادھر کہیں کھجور گر جائے اور مجھے اٹھانا نہ پڑے، اور اٹھ کر کے اس کو اٹھانا پڑے تو تکلیف ہوگی، تو میں پہلے سے منھ کھولے ہوئے ہوں، سیدھا منھ میں گرے۔ کوئی اس طرح مدرسوں میں نہیں ہوتا کہ آپ منھ کھول کر مدرسوں

میں بیٹھے رہیں، نہیں! آپ کو استادوں کو پکڑنا چاہیے، ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے، یا ان کے پاس جانا چاہیے، ان کی خدمت کرنی چاہیے، ان کی نگاہ اور ان کا دل اپنی طرف متوجہ کرنا چاہیے، میں آپ سے کہتا ہوں، دس باتوں کی بات، پچاس باتوں کی بات یہ کہ محنت سے پڑھیے اور سمجھئے، یہیں سب کچھ ملے گا آپ کو، کچھ ابھی سے خواب نہ دیکھیے۔

اساتذہ سے کچھ باتیں

ندوہ کے اور کسی اور مدرسے کے اور استادوں سے بھی کہنا میرا کچھ نامناسب نہ ہوگا، یہ آپ کے استاد ہیں، مگر ہمارے یہاں طالب علم رہ چکے ہیں، خاص طور جو لوگ آپ کو عربی پڑھاتے ہیں، اور دوسرے کہ ہم بھی ان کے ہم پیشہ ہیں، ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اور ہماری زندگی پڑھانے ہی سے شروع ہوئی۔

جو کچھ آیا پڑھانے سے آیا

اصل میں ہم مدرس تھے، اب لوگ کچھ اور سمجھنے لگے، اور معلوم نہیں کیا کیا لکھتے ہیں، مگر اصل میں تو ہم مدرس ہیں، اور جو کچھ آیا پڑھانے سے آیا، ہماری زندگی جو کچھ بنی پڑھانے سے بنی، دو حروف جو کچھ آئے پڑھانے سے، پڑھا تو تھا، ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہم نے بہت محنت سے پڑھا تھا، محنت بھی کی تھی بعض بعض چیزوں پر، لیکن اصل میں ہم کو جو کچھ فائدہ ہوا پڑھانے سے ہوا، پڑھایا ہم نے معلوم نہیں کتنا، لیکن اس کے لیے پڑھا بہت، پڑھانے میں ہم نے بہت پڑھا، اب میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ مجھے عربی کا مقرر سمجھا جاتا ہے، واقعی میں تقریر کرتا ہوں اور عرب میں بھی کرتا ہوں۔

لیکن آپ کو شاید تعجب ہو، مجھے کہنا تو نہیں چاہیے کہ آدمی خود اپنی نظر میں حقیر ہو جاتا ہے، مگر کچھ کہنے میں حرج نہیں، شاید کچھ فائدہ ہو، کہ میرے اندر عربی تقریر کی استعداد پیدا ہوئی درجہ اول میں، جب میں درجہ اول میں کہانیاں پڑھایا کرتا تھا تو مجھے خیال ہوا کہ میں ان سے کہانی کہوں اور دوسری کہوں، مجھے اس کہانی کے لیے بہت آسان زبان استعمال کرنی

پڑتی تھی اور بہت پھیلا کر کے کہنے پڑتا تھا، اس لیے کہ چھوٹی عمر کے لڑکے تھے، قاعدہ ہے کہ جب بچہ کہانی کہتا ہے تو کہتا ہے: "پھر یوں ہوا پھر وہ ہوا" اور بہت سی باتیں زائد کہتا ہے، جن کا کہانی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا، اماں نے یوں کہا اور بہن نے یوں کہا اور پھر ابا نے یوں کہا، اور یوں طول دیتا ہے، یہ بچوں کی فطرت ہے، اور ہم نے بھی اس طرح سے کہانی شروع کی، تو اس سے مشق ہونی شروع ہوئی، اور ہماری مشق جو شروع ہوئی وہ کہیں مصر و شام جا کر نہیں ہوئی، کوئی یہ سمجھے کہ وہاں جب گئے تو مشق شروع ہوگئی، ہماری مشق تو درجۂ اول، درجۂ دوم میں ہوئی، ہم نے پیغمبروں کے قصے کہنے شروع کیے، اور اسی سے یہ قصص النبیین کتاب کا خیال پیدا ہوا اور وہ کتاب تیار ہوئی۔

طلبہ میں استعداد اور دینی ذوق پیدا کریں

استادوں سے یہ کہنا ہے کہ ایک تو استعداد پیدا کیجیے، آپ کا سب سے بڑا کام اور آپ کا بہت بڑا وظیفہ یہ ہے کہ آپ اپنے طلبہ کی صرف ونحو درست کرائیں، آج سارے مدارس میں اور سارے ہندوستان میں استعداد کی کمی اور کمزوری ہے، جس میں شک نہیں، کہنے کی بات نہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ ابھی سے ان میں دینی ذوق پیدا کریں، دینی ذوق کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کو تہجد پڑھائیں، اگر آپ پڑھائیں تو میں آپ کو روکوں گا کہ ابھی ان بچوں کو معاف کیجیے، مہربانی کیجیے، ابھی ان کے تہجد پڑھنے کا زمانہ نہیں آیا، ان کو سونا چاہیے، چھ گھنٹے ان کے لیے ضروری ہے بلکہ سات آٹھ گھنٹے ان کے لیے سونا ضروری ہے۔

ذوق کا مطلب یہ ہے کہ دین ان کو اچھا لگنے لگے، دین کی عزت ان کے دل میں پیدا ہو جائے، اور دین کی محبت پیدا ہو جائے، اور اہل دین ان کو بھلے لگنے لگیں، دینی شعائر جو ہیں ان کو کوئی حقارت محسوس نہ ہو، بلکہ ان میں ان کی عزت اور عظمت محسوس ہو، اتنی بات اگر آپ نے کر دی، انبیاء علیہم السلام کے قصے، پیغمبروں کے قصے ان کے کانوں میں پڑتے رہیں، اور اولیاء اللہ کے حالات ان کے کانوں میں پڑتے رہیں، تو پھر انشاء اللہ یہ چاہے کتنی مغربی تعلیم حاصل کرلیں، اور چاہے یورپ اور امریکہ چلے جائیں، مگر وہ محبت جو ان کے دل میں بیٹھ گئی

ہے، وہ کبھی نکلے گی نہیں، یعنی دیکھیں کہ نماز کے لیے آپ کتنا اہتمام کرتے ہیں، آپ ان سے نہ کہیے کہ نماز کا وقت ہوگیا، آپ اظہار کیجیے یعنی ان کے سامنے نمونہ لائیے کہ جب اذان ہو جاتی ہے تو آپ کا کسی کام میں جی نہیں لگتا، اور نماز کا اہتمام، پھر آپ یہاں جتنی دیر رہیے ، معلوم ہو، ان لوگوں کو محسوس ہو کہ آپ ہر جگہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں، اور آپ کے ذہن میں ہر وقت خدا کا خیال اور فکر رہتی ہے، اس طریقے سے گفتگو میں، ہر چیز میں آپ کا نمونہ ان کے سامنے ایسا آنا چاہیے کہ ان کے دل میں اگر عظمت قائم ہوگئی، بیٹھ گئی دین کی، تو یہ اگر الحاد کے دور سے بھی گزریں گے تو انشاءاللہ بچ جائیں گے۔

ابتدائی تربیت کا نتیجہ

ایک زمانہ میں میں نے ہندوستان کے چوٹی کے علماء، ادیبوں اور مفکروں کو جو اس زمانے میں تھے، ذہن میں تھے، ان کو خط لکھا کہ آپ سب لوگ یہ لکھیے کہ کس کتاب سے آپ کو زیادہ فائدہ پہنچا، چنانچہ بڑے اونچے اونچے لوگوں نے مضامین لکھے، ہر طبقے کے بہت ممتاز لوگوں نے مضامین لکھے، اور اس زمانہ میں ''الندوہ'' کا ایڈیٹر تھا، میں اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ہم لوگوں نے مضامین شائع کیے پھر اس کے بعد مولانا عمران خان صاحب نے اس کو ایک مجموعہ میں شائع کر دیا، ''اہل علم کی محسن کتابیں''،(۱) کبھی خدا موقع لائے اور آپ لوگوں کو پڑھنے کا بھی شوق ہو، اور پڑھنے کی قابلیت ہو، پڑھیے گا اس کو، بہت کام کی چیز ہے، تو اس میں میاں شبیر احمد صاحب ابھی ان کا انتقال ہوا ہے پاکستان میں، پاکستان کے ترکی میں سفیر تھے، بڑے ادیب، ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر تھے اور سرپرست، اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہت اونچا مقام تھا ان کا، ان کو بھی لکھا تو انہوں نے لکھا کہ مجھے پر بڑے بڑے شدید حملے ہوئے الحاد اور لادینیت کے، اور فلسفہ کے، اور بعض مرتبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہ ایمان کی چنگاری بجھ جائے گی، اور ایمان کا شعلہ گل ہو جائے گا اور شاید ہو بھی گیا، لیکن جب مجھ پر کوئی نرغہ ہوتا تھا یا سخت حملہ ہوتا تھا، تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی

(۱) یہ کتاب اب دوبارہ ''ادارہ احیائے علم و دعوت'' لکھنؤ کی طرف سے مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔

شخصیت میرے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی، جس سے میں ''الفاروق'' کے ذریعہ سے متعارف ہوا تھا، ''الفاروق'' پڑھیے علامہ شبلیؒ کی، ان کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے، پس وہ میرے دل میں تصویر بن گئی، اور جب مجھ پر الحاد کا اور روشن خیالی کا حملہ ہوتا تھا تو میں کہتا کہ ایسا آدمی باطل نہیں ہوسکتا ہے جیسے حضرت عمرؓ کی شخصیت ہے، اور میں اس کی وجہ سے بچ جاتا تھا۔

بچوں کے دلوں میں کسی شخصیت کی محبت پیدا کیجیے

ایسے ہی آپ لوگ ان بچوں کے دلوں میں کسی شخصیت کی محبت پیدا کر دیجیے، میں بہت خوش ہوا کہ میں نے دیکھا کہ سیرت پر بچوں نے بڑے سلیقہ کی تقریریں کیں، اردو میں، انگریزی میں، مجھے البتہ اس کی شکایت ہے اپنے عربی کے اساتذہ سے کہ عربی سے جتنا تناسب ہونا چاہیے تھا وہ کم ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اپنا کوٹا اس میں پورا نہیں رکھا کہ یہاں جامعہ اسلامیہ میں دو یا تین انگریزی کی تقریریں تھیں تو دو تین عربی کی ہونی چاہیے تھیں، بلکہ زیادہ ہونی چاہیے تھیں، اب معلوم نہیں کیا وجہ اس کی کہ انگریزی زیادہ آسان سمجھی جاتی ہے، اور اس کے اساتذہ جلدی سے اس کی مشق کرا دیتے ہیں، یہ بات ہے یا یہ کہ جیسا کہ ہمارے پرنسپل صاحب، ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو جلسہ کنڈکٹ کر رہے تھے، جنھوں نے جیسا کہا کاٹ چھانٹ کرنی پڑی، ممکن ہے عربی کی چند تقریریں باقی ہوں، سننے کا مجھے موقع نہ ملا ہو۔

عربی زبان کو مرکزی زبان بنایئے

بہرحال میں اپنے ان عزیز بھائیوں سے یہ کہتا ہوں کہ عربی زبان کو مرکزی بنایئے اور عربی زبان یہاں بہت نمایاں ہونی چاہیے، کوشش کیجیے، یہ الزام بالکل غلط ہے کہ عربی زبان مشکل ہے، آپ کے لیے تو بہت آسان ہونی چاہیے، آپ لوگ مشق کرایئے، مکالمے، تقریریں، مضامین، سب چیزیں عربی میں ہوں، کتاب کو سمجھ لینا بالکل کافی نہیں۔

عربی زبان کی تعلیم کا اصول

فن تعلیم کے لحاظ سے کتاب کے معنی بیان کر دینا بالکل کافی نہیں، اس کو اتنا پڑھنا

چاہیے کہ اس کے بہت سے الفاظ یاد ہو جائیں، اور اس کو مختلف طریقوں پر ادا کرنا چاہیے، بہت سے سوال کا جواب ہو، کبھی الٹ کر، کبھی پھیر کر، کبھی ادھر گھما کر، مثلاً ابھی میں ممبئی کے ایک مدرسہ میں گیا، تو وہاں وہ پوچھ رہے تھے، سوالات اور جوابات جو پہلے سے تیار تھے، وہی کیے جا رہے تھے، اور لڑکے وہی رٹے ہوئے جوابات دے رہے تھے، میں نے کہا: یوں نہیں بلکہ سوال بدل کر پوچھیے، ان سے کچھ اور کسی شکل میں پوچھیے، جس سے معلوم ہو کہ ان کے ذہن نے اخذ بھی کیا یا نہیں، مثلاً اگر یوں کہنا ہو کہ ''سچ بولنا کیسا ہے؟'' تو کہیں گے: بہت اچھا ہے، یوں نہیں، بلکہ یوں بھی پوچھیے کہ ''جھوٹ بولنا کیسا ہے؟'' وہ کہیں گے ''برا ہے''، تب سمجھئے کہ انہوں نے اس بات کو سمجھا کہ سچ بولنا اچھا ہے، یا سب سے بڑی نیکی کی بات کیا ہے، یا جھوٹا آدمی کیسے ہوتا ہے، میں مثال دیتا ہوں، اس طرح بدل بدل کر جس سے معلوم ہو کہ وہ سمجھ بھی رہے ہیں یا نہیں، یا صرف رٹ لیا ہے۔

فارغ التحصیل کا لفظ بہت غلط ہے

اور باقی ایک بات اور بھی کہوں گا اور سمجھتا ہوں کہ کچھ بے جا نہیں کہ کبھی بھی استادوں کو نہیں سمجھنا چاہیے کہ اب وہ فارغ ہیں، دیکھیے فارغ التحصیل کا لفظ بہت غلط ہے، ہمارے مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر بہت اعتراض کرتے تھے کہ فارغ التحصیل کیا مطلب؟ یعنی بس تحصیل سے فارغ ہو گئے، بالکل خالی ہو گئے، عربی میں فارغ کے معنی خالی کے ہیں، نہیں، اب تحصیل شروع ہوئی ہے، جو کسی مدرسہ سے پڑھ کر نکلا، اس کو سمجھنا چاہیے کہ اب اس کا کام شروع ہوا ہے، اب اسی وقت وہ پڑھنے کے قابل ہوا ہے، کچھ سمجھنے کے قابل ہوا، کچھ ذوق، وہ تو ایک چکر تھا نصاب کا، اور وہ ایسا چکر تھا کہ اس میں کچھ اور پڑھنے کی نوبت نہیں آتی تھی، اب جا کر کچھ ذوق پیدا ہوا، شد بد پیدا ہوئی، اب پڑھنا چاہیے، آپ لوگوں کو مطالعہ اپنا جاری رکھنا چاہیے۔

چھٹیوں میں کسی کے ساتھ وقت گزاریے

اور میں یہ بھی کہوں گا، یہ بات تو ذرا الگ کہنے کی تھی، معلوم نہیں کہ موقع ملے نہ ملے کہ

چھٹیوں میں کبھی کسی کے ساتھ وقت گزاریے، کسی وسیع ماحول میں، جہاں کتب خانہ ہو، جہاں کتابیں ہوں، نئی نئی چیزیں آتی ہوں، مہینہ دو مہینہ کے لیے کہیں کسی کے پاس چلے جایئے اور رہیے، تو اس سے انشاء اللہ جامعہ کو باہر سے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ ہی لوگ اخیر تک کام دیں گے، یہی چند باتیں میں نے جلدی میں کہی ہیں، باقی بھئی! کرنے سے ہوگا، کہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا، اگر ہم روزانہ درس دیں جب بھی کچھ فائدہ نہیں۔

اسی مدرسے کو سب کچھ سمجھیں

ایک بات طالب علموں کو کہی کہ اسی مدرسہ کو سب کچھ سمجھ کر اور اس کو بہت بڑی درس گاہ سمجھ کر، اور جامعہ واقعی صحیح معنی میں بہت بڑا ہے، اس کو آپ کافی سمجھیں، اور کہیں کسی اور طرف خیال نہ کریں، اور یہیں محنت کریں اور اپنی استعداد بنائیں۔

اصل چیز ہے دین کی عظمت

اور اساتذہ سے میں نے کہا کہ نمونہ اور دین کی عزت وعظمت ان کے اندر بٹھا دیجیے، بس سب کام ہو گیا، یہ کنجی ہے، اگر نماز روزہ بھی ہے اور تہجد بھی ہے اور دین کی عظمت نہیں، کوئی فائدہ نہیں، کسی وقت بھی آدمی چھوڑ دے گا، اگر نماز روزہ نہیں، دین کی عظمت ہے، تو انشاء اللہ نماز روزہ بھی پیدا ہو جائے گا، اصل چیز ہے دین کی عظمت، یہ سمجھیں کہ دین کیا چیز ہے، دین والے کیسے ہوتے ہیں، تو انشاء اللہ پھر یہ محفوظ رہیں گے، ان کا ایمان محفوظ رہے گا، اتنا ہی کام آپ نے کر دیا تو آپ پورے طور پر کامیاب ہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمدللّٰہ رب العالمین۔(۱)

---

(۱) جامعہ اسلامیہ (بھٹکل) میں ۳ر جنوری ۱۹۸۳ء کو کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از "ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام" صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۳۔

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری اور ان کی مطلوبہ صفات

میرے قابل احترام بزرگو اور قابل محبت بھائیو، اور عزیزو! میں اس وقت ایسا محسوس کررہا ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور اس تعارف کے بعد جو مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی زیدت فیوضہ (۱) نے میرے خاندان کا کرایا، اس کے بعد مجھے اور بھی قرب اور موانست محسوس ہوتی ہے، کم از کم درجہ یہ ہے کہ میں ایسا محسوس کررہا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عزیز طلبہ اور رفقائے کار اساتذہ کے سامنے بیٹھا ہوں، اور ان سے باتیں کررہا ہوں، میں بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان عزیزوں اور بھائیوں سے باتیں کرنے کا موقع دیا، اس کا امکان تھا کہ آپ میری صحت کی رعایت یا میری مشغولیت کے خیال سے مجھے دعوت دینا مناسب نہ سمجھتے، لیکن بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ زریں موقع مہیا کیا۔

کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے

اب میں بغیر کسی معذرت اور تواضع کے کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے آپ کے سامنے رکھوں گا، جو میں نے اپنے کراچی کے قیام کے چار دن کے مطالعہ اور مشاہدہ سے اخذ کیے ہیں۔

سیاسی اصطلاحات اور سیاسی تصورات اپنی جگہ پر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے علماء کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کے لیے تقدیر الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان

(۱) دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باعث صد افتخار شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ کے پوتے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ مرحوم کے بعد ''مفتی اعظم پاکستان'' کہے جاتے تھے۔

میں رہے، تا کہ وہاں دعوت اسلامی کا فرض انجام دے، اور مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدو جہد میں مشغول رہے، دوسرے حصہ کے لیے قدرت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ اس ملک میں جہاں پہلے بھی مسلمان (اکثریت میں) تھے (بلکہ اسی راستہ سے برصغیر میں آئے تھے) ملت کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دے اور عالم اسلام کے لیے ایک آزاد اور مثالی اسلامی ملک کا نمونہ پیش کرنے میں مدد اور رہنمائی کرے۔

أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَأَنَا حَيٌّ؟

عزیزانِ گرامی! دنیا کے صالح وصحت مند تغیرات وانقلابات اور انسانی عزیمت کی فتوحات کی تاریخ پر اگر کوئی کتاب مستقل طور سے لکھی جائے تو نائبین انبیاء اور افرادِ امت کی زبان سے جو جملے نکلے ہیں، ان میں ایک جملہ کو سب سے نمایاں اور ممتاز مقام دیا جائے گا اور اس کو آبِ زر سے لکھا جائے گا، یہ جملہ ایسا ہے جس نے حالات کی رفتار کو ایسا بدلا ہے جس کی مثال مِلل وادیان کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، جزیرۃ العرب کے ایک حصہ میں اور بعض قبائل میں ارتداد نے سر اٹھایا، یہ نازک ترین مرحلہ تھا، کہ آنحضرت (ﷺ) کے دنیا سے تشریف لے جانے کے قریب ہی زمانہ میں اسلام کے قلب وجگر میں ایک شگاف پیدا ہو رہا تھا، یہ بڑی نازک صورت حال تھی، ابھی حضور اکرم (ﷺ) نے دنیا سے پردہ فرمایا ہے، اور اس کو کچھ ہی مہینے گزرے ہیں کہ عرب جن کو ساری دنیا میں اسلام پھیلانا تھا اور جن کو ایک امت مبعوثہ کی طرح اسلام کی دعوت دینی تھی، وہ خود ارتداد کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں، ایسا نازک وقت پوری تاریخ اسلام میں (وفات نبوی کے بعد سے اس وقت تک) نہیں آیا، اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی زبان سے ایک فقرہ نکلا، جس نے تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیا، اور خطرے کا کہرا اس طرح چھٹ گیا جس طرح آفتاب کے نکلنے سے چھٹ جاتا ہے، آپ نے فرمایا (اور تاریخ نے اسی طرح ان الفاظ کو تبرک اور امانت سمجھ کر محفوظ کر لیا ہے) "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَأَنَا حَيٌّ؟" (کیا دین میں کوئی قطع وبرید ہو سکتی ہے اور میں زندہ رہوں؟) ابوبکر زندہ ہو اور پھر اللہ اور رسول اللہ کے دین میں

کوئی قطع و برید ہو، کوئی کتر بیونت ہو، کوئی انتخاب کا مسئلہ ہو کہ اس رکن کو لیں گے اور اس رکن کو چھوڑیں گے، آپ کو معلوم ہے کہ اسی وقت منع زکوۃ کا فتنہ نمودار ہوا تھا، مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور ساتھ ساتھ ارتداد پھیلنا شروع ہو گیا تھا، چند مقامات کا نام آتا ہے، مثلاً مدینہ طیبہ، جُراثی اور بعض مقامات کا کہ وہاں ارتداد کے اثرات نہیں پھیلے تھے، ورنہ گویا پورا جزیرۃ العرب ارتداد کی لپیٹ میں آرہا تھا، اس وقت اللہ کے ایک بندے نے اپنی زبان سے یہ کہا، یہ تو الفاظ ہیں، لیکن ان الفاظ کے ساتھ جو دلی درد اور جوش تھا، اس کو تو تحریر میں نہیں ادا کیا جا سکتا، یہ ان کے دل کی آواز تھی اور ان کے جذبات کا نقطۂ عروج تھا، جس طرح سے کوئی جام لبریز ہو جاتا ہے تو چھلک جاتا ہے، زمین پر جو قطرے گرتے ہیں وہ ان الفاظ کی شکل میں ہیں۔

امت کی وراثت

یہ وراثت ہے جو امت کی طرف عمومیت سے، اور نائبین رسول اور علمائے حقانیین کی طرف خصوصیت سے منتقل ہوئی، یعنی ان کو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کسی ملک میں اسلام کا زوال کسی طرح سے قابل برداشت کیا، قابل تصور بھی نہیں، ہم کسی ملک میں موجود ہوں اور وہاں اسلام کا زوال ہو جائے، یہ بات ممکن نہیں، یہ احساس بنیاد ہے سارے انقلابات اور دینی جدوجہد کی تاریخ کی، آپ دعوت وعزیمت کی تاریخ پڑھتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے خلق قرآن کے عقیدہ کے خلاف سربکف ہو جانے میں، امام ابوالحسن اشعریؒ کے اعتزال کے مقابلہ میں صف آراء ہو جانے میں، امام غزالیؒ کے باطنیت اور مادیت کے مقابلہ اور اسلامی معاشرہ کے مختلف طبقات وعناصر کے دینی احتساب کے کارنامے میں، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے رد روافض میں، بعض کلامی مسائل کی تنقیح کی شکل میں، ہندوستان کے اس ایک تجدیدی کارنامے میں جو تقریباً چار سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے، اور جس کے اثرات ابھی تک زندہ ہیں، شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی مصلحانہ اور مجددانہ دعوت میں، حضرت سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) اور اکابر دیوبند کے اپنے اپنے وقت میں اور رنگ میں اصلاحی وتربیتی

جد و جہد اور اشاعت کتاب وسنت اور عقائد صحیحہ کی سرگرمی میں، یہی احساس کام کررہا تھا، جس کی ترجمانی صدیق امت نے کی تھی، اور ہر دور کے تابعین رسول کو یہ روشنی دکھائی تھی:

﴿وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾[سورۃ الزخرف:۲۸]۔

علماء اپنا احتساب کریں

اس روشنی میں علماء اپنا احتساب کریں کہ انہوں نے اس جملہ کو کہاں تک اپنا اصول اور دستور العمل بنایا؟ وہ یہ دیکھیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کے ملک میں اسلام یا اسلامی معاشرہ کے زوال کا کوئی جواز ہے؟ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں ہمارے سامنے بڑی عبرتناک مثالیں ہیں، جن ملکوں میں اسلام کا زوال ہوا، یا وہاں دشمنِ اسلام طاقتیں غالب آئیں، آپ اگر تحقیق کریں گے تو ان میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جن سے اس دور میں سبق لیا جاسکتا ہے، ان میں ایک چیز تھی علماء کا شدید اختلاف، اور دوسری چیز یہ تھی کہ علماء کا عوام سے رابطہ نہیں تھا، ان کی شخصیتیں اتنی موثر نہیں رہ گئی تھیں کہ عوام کے قلوب میں دین کا احترام اور علماء کا وقار قائم رکھتیں، وہ ملک جس نے خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کو پیدا کیا، جس نے خواجہ عبیداللہ احرارؒ کو پیدا کیا، وہ ملک طاقتور روحانی شخصیتوں سے خالی ہوگیا تھا، معیار زندگی بہت بلند ہوگیا تھا، مادیت اپنے عروج پر تھی، ابھی تک امیر بخارا کا محل باقی ہے، اور کمیونسٹ حکومت اسے دکھاتی ہے کہ دیکھیے، کس طرح دولت جمع کی گئی تھی، کس طرح سونے چاندی کے ظروف تھے، بقول ان کے عوام بھوکے مر رہے تھے اور امیر بخارا کے محل میں یہ چیزیں تھیں، اسی طریقہ سے آپ اندلس کی تاریخ میں مدینۃ الزہراء اور قلعۃ الحمراء کی تفصیلات پڑھیں، خواب وخیال اور جن و پری کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہاں دو بڑے عنصر اسلام کے زوال کا باعث ہوئے ہیں، ایک معیار زندگی کی بلندی اور اللہ کی دی ہوئی دولت کا غلط استعمال، اور دوسرے یہ کہ اشاعت اسلام اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے بجائے انہوں نے فنون لطیفہ، شعر و شاعری اور ادبیات وغیرہ پر ساری توجہ مرکوز کردی تھی، تیسری بات یہ ہے کہ حاکم خاندان میں حکومت کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی، سیاسی پارٹیوں کا وہ عہد نہیں ہے، اب اس کی جگہ سیاسی پارٹیوں نے لے لی ہے،

یہ تین عنصر تھے اندلس کے زوال کے، (اس پر اضافہ کیجیے اخلاقی زوال کا) آپ اگر ''صبح سمرقند'' کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں کیا اخلاقی زوال اور انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔

خطرات اور اندیشے

میں چند خطروں کی طرف نشاندہی کرتا ہوں، بعض مرتبہ باہر سے آنے والا اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو گھر میں رہنے والا محسوس نہیں کرتا ہے، آپ روشنی میں ہیں، اگر کوئی شخص باہر اندھیرے سے آئے گا تو اس کی کیفیت دوسری ہوگی، اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہر وقت دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے سے ایسی مانوس ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوتی، اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی، لیکن باہر سے آنے والا اس کو فوراً محسوس کرلے گا، مثلاً یہاں اردو کے سائن بورڈ عام طور پر لگے ہوئے ہیں، آپ کو تو بالکل نہیں محسوس ہوں گے، لیکن ہم ہندوستانی جب یہاں آئیں گے، تو جو انگریزی یا ہندی کے سائن بورڈ دیکھنے کے عادی ہیں، تو ایک خوشی محسوس کریں گے، اور کہیں گے کہ ماشاء اللہ یہاں تو ہر طرف اردو ہی اردو نظر آتی ہے، ایسے ہی بعض لوگ تختیاں لکھ کر دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں، تو ان میں جو چیزیں لکھی ہوتی ہیں آدمی غور سے پڑھتا ہے، پھر پڑھنا چھوڑ دیتا ہے، مجھے نہ کسی دور بینی کا دعویٰ ہے اور نہ دُروں بینی کا، نہ بصیرت و فراست کا، بقول اقبالؔ ؎

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں باہر سے آرہا ہوں، اس لیے میری بات توجہ کے قابل ہے۔

اعتقادی اور سیاسی انتشار سخت خطرناک ہے

اپنے اس تاریخی مطالعہ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ اعتقادی

اور سیاسی انتشار اس ملک کے لیے سخت خطرناک ہے، یہاں مذہبی گروہ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں، بعض بحثیں جو علمی انداز میں ہو سکتی تھیں، ان کو عوام میں لے آیا گیا ہے، اوران کی بنیاد ہی پر متحارب کیمپ اور متوازی محاذ بن گئے ہیں، یہ سخت خطرناک بات ہے، میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آپ کا تعلق ہے، میرے احساسات بالکل وہی ہیں جو آپ کے ہیں، اورصرف احساسات نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں نے تو وہ جھنڈا بلند کیا جس کی وجہ سے ہم کو نئے نئے لقب ملے، اور سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اگر زمین ہی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی تو پھر یہ عمارتیں کس پر قائم ہوں گی؟ ایک گروہ یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہے کہ پاکستان ہم نے بنایا ہے، دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ہمیں حق پر ہیں اور ہمارا ہی اس ملک پر اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیے، اگر ٹٹولا جائے (معاف کیجیے گا میں کسی پر حکم نہیں لگاتا) تو اس کے پیچھے حبّ جاہ کا جذبہ نکلے گا، ہمارے بزرگوں نے ملک میں دین کو بچانے کے لیے بڑی قربانی دی ہے، اور ضرورت پڑی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے، اور دب گئے ہیں، جھک گئے ہیں، اور نیچے اتر آئے ہیں، انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ بھائی آپ ہی اوپر بیٹھیے، مگر دین باقی رہ جائے، یہ ہمارے بزرگوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک اوران کے مکتب فکر کے لوگوں کی ہندوستان میں یہی روایت رہی ہے، آپ درس کے حلقوں اور علمی مجلسوں میں اختلافی مسائل پر آزادی کے ساتھ گفتگو کیجیے، ان مسائل پر کتابیں لکھیے، مگر ملک کو داؤ پر نہ لگائیے، جب کوئی ایسا محاذ قائم کیا جاتا ہے اوراس طرح کی دعوت دی جاتی ہے جس میں احساس برتری یا اظہار برتری ہوتا ہے، تو اس کے مقابل دوسرا محاذ بن جاتا ہے اور وہاں سے صدائے ''ہم چوں من دیگرے نیست'' بلند ہونے لگتی ہے، ہمارے بزرگوں کا سارا کام تواضع کے ساتھ تھا، اہتمام نفس کے ساتھ تھا، ''ایمان واحتساب'' کے ساتھ تھا، ان کو سیادتؐ وقیادت کا دعویٰ تھا اور نہ یہ کہ ہماری جماعت ہی نے سب کچھ کیا ہے اور ہمیں سب کچھ ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکاتیب پڑھیے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مکاتیب پڑھیے، ہندوستان کے اس دور میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی، اس وقت انہوں نے احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ وغیرہ کو جو

خطوط لکھے ہیں، ان کو آپ پڑھیے، ان میں کیا درد ہے، احمد شاہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مفصل خط لکھا ہے، اس میں بتایا ہے کہ مسلمان اس وقت کس بے بسی کی حالت میں ہیں، اس میں انہوں نے کیا موثر جملہ لکھا ہے جس سے ان کی دردمندی اور اخلاص ٹپکتا ہے: (میں رسول اللہ (ﷺ) کو شفیع بناتا ہوں کہ اللہ کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے اور ایک مرتبہ آجایئے)۔

چنانچہ احمد شاہ ابدالی انہیں کی دعوت پر آئے اور انہوں نے مرہٹہ طاقت کی ایسی کمر توڑی کہ آج تک وہ پورے طور پر سرنہیں اٹھا سکی، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی ہی تھے اور ان کا درد تھا، اور ان کی بصیرت تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا، آپ انہیں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ملت اور دین کے لیے جس ایثار وقربانی کی ضرورت ہے، وہ پیش کیجیے، اور صاف کہیے کہ اچھا بھائی! تم ہی صحیح، تمہارا ہی کارنامہ سب سے بڑا ہے، ہم سب مل کر اس ملک کو بچائیں، موجودہ خطروں اور اندیشوں میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ علماء اس طرح دست وگریباں ہوں، یہ بات میں اپنے عقائد کے پورے تحفظ کے ساتھ کہتا ہوں، الحمد للہ ایک شوشہ سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں، نہ عبادت کے مسائل میں، نہ اپنے عقائد کے اصول میں، کسی چیز میں کسی مفاہمت کے لیے میں تیار نہیں، ایک تو اپنا عمل ہے اور ایک یہ کہ اکھاڑا بنا دیا جائے، عوام کو آلۂ کار بنایا جائے، اور سارے ملک کو میدان جنگ میں بدل دیا جائے، ایک کانفرنس ہو رہی ہے یا رسول اللہ کی اور ایک کانفرنس ہو رہی ہے محمد رسول اللہ کی[1] یہ جینے کی باتیں نہیں، اس موقع پر اقبال کا شعر مجھے یاد آرہا ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

عوام سے رابطہ بڑھایئے!

دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے ساتھ آپ کا رابطہ ہونا چاہیے، میں نے محسوس کیا کہ علماء

(۱) اس وقت پاکستان میں یہی سننے میں آرہا تھا۔

کا عوام سے جو ربط ہونا چاہیے اس میں کمی ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں علماء کا عوام سے ربط یہاں سے زیادہ ہے، وہاں سیاسی میدان میں بھی، علمی، ادبی اور تحقیقی میدان میں بھی علماء پیش پیش ہیں، اور ان کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے، وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ (Intellectual Class) علماء سے متوحش نہیں ہے، ہم ادبی اور علمی مجلسوں میں جاتے ہیں اور الحمدللہ وہاں ہم کو عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے، عوام سے آپ کا ربط بڑھنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ عوام آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

وقار اور امتیازی شان پیدا کیجیے!

تیسری بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ ہماری زندگی عوام کی زندگی سے ممتاز ہو، دیکھنے والا دیکھے کہ یہ دنیا کے طالب نہیں ہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں ہے، ہمارے کام زیادہ تر حسبۃً للہ ہوں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے، جب تک ہمارے طبقۂ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا، ایثار کا مادہ نہ ہوگا، ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی، دل و دماغ میں دین کا گہرا اثر اور وقار نہیں ہوگا، علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ کتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہاں اتنے طالب علم پڑھتے ہیں، اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں، اس سے علماء کا وقار نہیں قائم ہوگا، علماء کا وقار قائم ہوتا ہے ذاتی نمونے سے، عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس پر جان دے دی جائے، لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو خاطر میں نہیں لاتے، ہم نے سمجھا ہے کہ دولت سب سے بری چیز ہے، ان کے یہاں دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے نواب صاحب ڈھاکہ کو جواب دیا تھا، نواب صاحب نے کہلوایا کہ آپ مجھ سے مل لیں، حضرت نے کہلوایا کہ نواب صاحب سے کہنا کہ آپ کے پاس جو چیز ''دولت'' ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن میرے پاس جو چیز ہے وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے، اس لیے آپ کو آنا چاہیے، مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔

ایک واقعہ آپ کو اور سنا دوں، بڑا موثر ہے، شیخ سعید حلبیؒ ایک بزرگ عالم تھے، ایک دن دمشق کی ایک مسجد میں سبق پڑھا رہے تھے، اس دن ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی (یہ واقعہ اگرچہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ سنائے، لیکن واقعات کے بغیر کام نہیں چلتا، چھوٹا آدمی بھی اگر یہ واقعہ سنائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے) ہاں! تو شیخ سعید درس دے رہے تھے، آپ جانتے ہیں کہ مسجد میں جب درس دیا جاتا ہے تو پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور سامنے طالب علم ہوتے ہیں، تو سامنے سے جو آتا ہے، استاد تو دیکھتا ہے طالب علم نہیں دیکھتے، ابراہیم باشا جو محمد علی خدیو، بانی سلطنت خدیویہ کا فرزند تھا، اور بڑا باجبروت حاکم وسپہ سالار تھا، جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جس سے لوگ کانپتے تھے، وہ دروازہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہوا، حضرت کے پاؤں میں تکلیف تھی، اس لیے دروازہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، جب وہ قریب آیا تو طالب علموں نے دیکھا کہ وہ ہے اور اس کے ساتھ حفاظتی دستہ بھی ہے، جلاد اور پہرہ دار بھی ہیں، طالب علم سمجھے کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو، پاؤں سمیٹ لیں گے، حاکم کا بھی ادب ہوتا ہے، شیخ نے بالکل جنبش نہیں کی، پاؤں پھیلائے رہے، وہ سامنے آیا اور کھڑا ہو گیا، مؤرخ نے لکھا ہے کہ طالب علموں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ اب جلاد کو حکم ہوگا اور استاد کا قابل احترام خون ہمارے کپڑوں پر نہ پڑے، وہ دیر تک کھڑا رہا، اس پر ایسا جلال طاری ہوا کہ کچھ بولا نہیں، سبق سنتا رہا اور پھر چلا گیا، بعد میں شیخ سعید حلبیؒ کے لیے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا، اہل اللہ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے، سلام کہلوایا اور کہا کہ یہ قبول فرمایئے، جو جملہ انہوں نے جواب میں کہا، وہ جملہ سننے کے قابل ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ایسے ایک جملہ پر غزلوں کے دس دیوان قربان کیے جا سکتے ہیں، انہوں نے کہا "اپنے ولی نعمت سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا"، "اَلَّذِيْ يَمُدُّ رِجْلَهُ لَايَمُدُّ يَدَهُ" یہ جملہ اسی طرح نقل ہوا ہے، اگر مجھے ہاتھ پھیلانے ہوتے تو میں اس وقت پاؤں نہ پھیلاتا، پاؤں سمیٹ لیتا، لیکن یہ علامت ہے کہ میں ہاتھ پھیلانے والا نہیں تھا، جو پاؤں پھیلاتا ہے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے، یہ جوہر علماء میں، دین کے خادموں میں دسویں درجہ میں، پچاسویں درجہ میں سہی، ہونا چاہیے، اگر یہ جوہر نہیں ہے تو میں صاف کہتا ہوں کہ

آپ کی ساری علمی قابلیت اور آپ کی ساری خطابت جس میں آپ ممتاز ہیں (سیاسی جماعتوں میں بھی ایسے خطیب ہوں گے) سب بے اثر ہے، جب تک کہ آپ کا عملی نمونہ نہ ہو، اہل اقتدار یہ نہ سمجھیں کہ علماء خریدے نہیں جاسکتے، علماء پیسے کے غلام اور دولت کے بندے نہیں ہیں، علماء ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتے، علماء کی زندگی ہم سے زیادہ سادہ ہے، علماء ہم سے کم درجہ کے مکانوں میں رہتے، کم درجہ کا کھانا کھاتے ہیں، اس کا اظہار ہونا چاہیے، ہمارے اسلاف نے اس کا اظہار کیا ہے، میں اپنے اساتذہ ہی کے واقعات سناتا ہوں کہ میں مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتا تھا، اور وہاں ہم لوگوں کے لیے کبھی کبھی پُر تکلف کھانے پکتے تھے، اور چونکہ میرا قریبی تعلق تھا، مدرسہ کے پیچھے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا قیام تھا، ان کے صاحبزادے مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم سے میرا قریبی تعلق تھا، وہ ہمارے دوست تھے، مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ آج وہاں فاقہ ہے اور یہاں پلاؤ پکا ہے، کیا مجال کہ چاول کی ایک کھیل وہاں پہنچ جائے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت سے دین کی خدمت کا جو کام لیا ہے، وہ انہیں صفات کا نتیجہ ہے، زہد، ایثار، قربانی کا جذبہ، تواضع اور اپنے خلاف بات سن کر ضبط کر لینا، دوسرے کو اپنے سے بہتر اور فاضل سمجھنا، ہماری جماعت کا یہ شعار کبھی نہیں رہا ہے کہ "ہم چوں من دیگرے نیست" بلکہ ہم نے بڑے سے بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے، مولانا مدنیؒ سے جب کوئی بیعت کے لیے کہتا تو میں نے حضرت کو بعض اوقات یہ شعر پڑھتے سنا ہے ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
درحیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا!

نہ پھول ہوں، نہ گھاس، نہ میں سبزہ ہوں، مجھے حیرت ہے کہ دہقان نے مجھے کس کام کے لیے پیدا کیا، ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اپنے سے شرمندہ ہیں، یہی بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا شعار رہا ہے۔

تہذیبی ولسانی تعصب ملک کے لیے سخت خطرناک ہے

تہذیبی ولسانی تعصب، صوبائی تعصب بھی اس ملک کے لیے سخت خطرناک ہے، اسی تعصب نے بنگلہ دیش کو پاکستان سے کاٹ دیا، اس لسانی تعصب، صوبائی تعصب کے خلاف علماء کو دورے کرنے چاہئیں اور اس کے خلاف اسلام کے احکام بیان کرنے چاہئیں، حدیث میں آتا ہے "مَنْ تَعَزَّى بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَعِضُّوهُ بِهَنِ أَبِيهِ وَلَاتَكْنُوا." (۱)، زبان نبوت جس پر وحی جاری ہوتی تھی، جس سے قرآن مجید دنیا نے سنا، جس کے متعلق آتا ہے کہ آپ (ﷺ) کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ نہیں نکلتا تھا، پہلی مرتبہ اور آخری مرتبہ سخت ترین لفظ جو زبان نبوت سے نکلے ہیں وہ ہیں: "کوئی شخص تمہارے لیے جاہلیت کا نعرہ لگائے اور خاندان، برادری، قوم کی دہائی دے اور اس کام پر ابھارے، تو اس کو اس کے باپ کی گالی دو، خالی کنایہ سے بھی کام نہ لو"۔ اللہ اکبر! اللہ کے رسول جن کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور شہد ٹپکتا تھا، اور قرآن مجید جن کی زبان سے جاری ہوتا تھا ﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [سورۃ النجم:۳-۴] اتنے سخت لفظ بولیں، مجھے یاد نہیں آپ (ﷺ) نے کسی مسئلہ میں اتنے سخت لفظ استعمال کیے ہوں، آپ کا فرض ہے کہ آپ پاکستان کے صوبوں میں جائیں اور خاص طور پر تمام صوبوں کے بچوں کو یہاں بلائیں اور ان کو پڑھائیں اور ان کو ایسا عالم بنائیں کہ خود بخود ان کو اس عصبیت جاہلیہ سے نفرت پیدا ہو جائے، پھر ان کو اس صوبہ میں بھیجیں جس میں یہ لسانی، نسلی، جغرافیائی تعصب پایا جاتا ہے، اس حمیت جاہلیہ نے ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور کئی اسلامی سلطنتوں کا چراغ گل ہو گیا۔

فخر سے نہیں عمل سے کام چلے گا

یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان کا جادو لوگوں کے دل و دماغ پر بٹھا دیں اور اپنی علمی

---

(۱) رواه النسائي في السنن الكبرى، كتاب السير، إعضاض من تعزى بعزاء الجاهلية، حديث رقم: ٨٨٦٤

قابلیت کا سکہ جما دیں، لیکن حقیقی احترام عملی نمونہ، سیرت کی بلندی، زہد و استغناء، روحانیت اور اخلاق عالیہ سے پیدا ہوتا ہے، علمی و فکری حیثیت سے بھی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی موثر شخصیتیں پیدا ہونی چاہئیں، ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اکابر ایسے تھے، ہر وقت اس کی رٹ لگانا اور اس کا وظیفہ پڑھنا کچھ کام نہیں دیتا، میں نے پچھلی مرتبہ یہیں جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے، ہم پاکستان میں دعوت و مسلک، تاریخ سے چلانا چاہتے ہیں، لوگ کہہ دیں گے کہ صاحب سن چکے، بہت سن چکے، سنتے سنتے طبیعت بھر گئی، آپ کے اکابر ایسے تھے، ایسے تھے، "پدرم سلطان بود، پدرم سلطان بود" بتائیے آپ کون ہیں؟ کام شروع کیجیے، تاریخ بہت سنائی جا چکی، کتابیں بہت لکھی گئیں، پورا کتب خانہ تیار ہے، اب حرکت اور عمل، جد و جہد و قربانی اور پر کشش و سحر انگیز زندگی کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

و آخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن (کراچی) میں مئی ۱۹۸۴ء میں کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از "تحفۂ پاکستان" صفحہ ۶۵ تا ۷۷۔

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

حضرات علمائے کرام اور اساتذۂ مدارس و جامعات!

قبل اس کے کہ آپ حضرات سے کوئی تفصیلی اور معین بات کہوں، ایک اصولی اور اجمالی بات کرنا چاہتا ہوں۔

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں، اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں، ہوتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے، اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی، اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہوگی، اس میں عامیانہ اور مبتذل انداز نہیں ہوگا، اس وقت عالمِ اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے، لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے، اور تحریکِ دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے، اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے، بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم و دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ

خلافتِ بنی امیہ و خلافتِ بنی عباس کی پشت پر اگر علماء و مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام بہ

حیثیت نظامِ حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں، ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روزِ روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے، اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے، وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے، ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمۂ مجتہدین، محدثین عظام اس زمانے میں نہ محنت کرتے، اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی، اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم ونسق قائم کرتی تھی، تو یہ سب کوششیں، فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالمِ اسلام کو زیروزبر کرڈالا، عالم اسلام کی چولیں ہلادیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، آپ اس زمانے کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں، تو ان سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے، اور ایک تاتاری اسے کھینچے لیے جارہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے، لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا، اور خاص طور پر اس خطۂ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا تھا، یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ، جو آخر میں فقہ کا (خاص طور سے فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے، اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمانوں کے علم نے مسخر کرلیا، اور ان کو اپنا بے دام غلام بنالیا، بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب ووسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک

سیدھا سادہ روایتی قانون تھا، جو قبائلی زندگی میں رائج تھا، اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا، نیم وحشی اقوام میں جیسے ''عُرف'' ہوتے ہیں، وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی، مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی علیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا، اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہو گئے، مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات و مسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی، فلسفہٗ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء، جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان، اور ہمارے قانون داں اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علمائے دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے، اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہو جائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے، اور جہالت سے اس کو فائدہ، تو خواہ تھوڑے عرصے کے لیے اپنے زور شمشیر، اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصہ پر قبضہ کر لے، لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکتا، سب یہی

خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے جہالت کی تاریکی چاہیے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا، اور جب علم آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، اس کا پردہ چاک ہو جائے گا، اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے، اسی طرح وہ چھپٹ جائے گا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی، حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، ان کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی، لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے زندگی سے اس کو علاحدہ کر لینا چاہیے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع للبقاء کے لیے سخت کشمکش تھی، ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی، عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح، نہ اس کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی، مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی، جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی ﴿وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ [سورۃ آل عمران: ۵۰] کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لیے مستقل شریعت لے کر آیا، تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں، مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، اس کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا، اور اس کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں کی شفقت پر، اجارہ داری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لیے دوڑ رہی تھیں، مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی، تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانہ، دوڑتے ہوئے

معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی وقت مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہیے، یہ انہوں نے نہیں کیا، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا، اور باقی زندگی کو، آئین کو، آئین سازی کو کھلی چھوٹ دے دی، دوسرا طبقہ علماء کا تھا، انہوں نے مخالفت شروع کردی اور کہا : ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے، اور اسی میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا، جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا، اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانے سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریباً چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لیے جدائی ہوگئی، اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہوگئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لیے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، میں نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی ﴿اِقْــرَأْ﴾ کے لفظ سے شروع ہوئی ہو، اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو، وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لیے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر

کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہ نما ہے

اس وقت عالم اسلام میں اہل علم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے، وہ زمانے کی تبدیلیوں اور علم وفن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ میں چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا تھا، جب انسانیت عہدِ طفولیت میں تھی، لیکن اس پُر پیچ، ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے، اور اپنی ذہانت سے، گہرے مطالعہ سے، اصولِ فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے، کتاب وسنت کے ان ازلی اور لافانی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانے میں نسل انسانی کی رہنمائی کر سکتے ہیں، اس تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی کچھ کمی ہوگی، اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہوسکتا ہے، وہ بے عملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہوسکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے، کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا، اور کسی اسلامی ملک میں دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں سم قاتل ہیں، سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی روح اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے انہیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ رہنمائی کر سکتا ہے، ساتھ دینا تو میں نے علی سبیل التنزل کہا، وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں، بلکہ وہ نئی زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کو خطروں سے صرف وہی بچا سکتا ہے، اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجیے!

علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا، اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا، تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دین و ملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیے، سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہیے، حضور (ﷺ) کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک مجلس میں واقعہ کے طور پر ذکر کیا کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے، وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، ہم نے چیتھڑے لپیٹ لیے، اسی وجہ سے وہ غزوۂ ذات الرقاع کہلاتا ہے، یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم سے یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہیں میرا یہ عمل باطل نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سن لیا، اور بڑا مجاہد سمجھا، یہ کافی ہے، اب ہم سے کیا لینے آئے ہو؟ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ کاش میں یہ نہ کہتا، ان کو اس کا افسوس رہا۔ (۱) آج اس پر زیادہ زور ہے کہ یہ کارنامہ کس کی طرف منسوب ہوگا، ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال، مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک تقریر میں کہنے لگے: اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دستِ حق پرست پر اسلام لایا، تاکہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دستِ حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے، بلکہ دستِ حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے، قبولِ اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے، لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازہ کی نماز پڑھانے کے لیے، اس لیے کہ اخبار میں کل یہ خبر چھپ جائے گی، یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا

(۱) رواه البخاري، حديث رقم: ۴۱۲۸

ہے، دیکھیے جب کسی کا عزیز جاں بلب ہوتا ہے، تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا، اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا، اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا، تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا، اس لیے کہ ان مخلصین نے جنھوں نے یہ خدمت انجام دی تھی، اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بیں نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جارہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی، اسلامی معاشرت وتمدن میں ڈھالنے کی، اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کردی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنی سپاہی بن جائیں، خالص اللہ کی رضا کے لیے کام کیجیے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھیے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، اس میں جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے، اور کس کا نام بعد میں ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے، اس جذبہ کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہیے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیے، جسے ہم حق سمجھتے ہوں اس کو حق سمجھنا چاہیے، اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن سب دعوتِ اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جا سکے اور یہ ملک دوسروں کے لیے نمونہ بنے۔

ایثار وقربانی

تیسری بات یہ کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز

کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کے دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لیے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا، اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں، اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء، ارکانِ سلطنت اور خالص دنیا دار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحبؒ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لیے رکھے، تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار! خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی، جو انہوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہرحال ہر شخص کو حق ہے، ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے چور نہ آجائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ تاثر نہ لینے دیں کہ کتاب و سنت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اور اصول فقہ کا جو ذخیرہ ہے، وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کر سکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں، یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے، وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں، اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں، اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں، وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کیڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم

نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کہ کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کر سکتا ہے، اس لیے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بہ تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آ کر جھکتا ہے اور مانتا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے، حضرت مجدد (رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لیے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے، بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے، بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے، ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے، مگر دور سے نگرانی کرتے رہے، حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے، ان کے حق میں مشورہ دیتے رہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے، اگر ہاتھ ڈال دو گے تو جل جاؤ گے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیے، کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا، میں اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (۱)

---

(۱) جامع مسجد، فیصل آباد (پاکستان) میں ۲۲ رجولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی ایک اہم تقریر، ماخوذ از ''دعوت فکر و عمل''، صفحہ ۷۹ تا ۹۱۔

غیرت صدیقی پیدا کیجیے!

﴿وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [سورة الزخرف:۲۸]

حضرات! تاریخ میں اور بڑے بڑے پیشوایانِ مذاہب اور داعیانِ انقلاب اور مصلحین امت اور بانیانِ سلطنت کے تذکرے میں ان کے بہت سے جملے نقل کیے گئے ہیں، جن میں ان کے دل کی تڑپ اور ان کا اندرونی سوز، ان کا یقین جھلکتا ہے، بلکہ تڑپتا ہے، اور ان فقروں نے اپنے اپنے وقت پر بڑا کام کیا ہے، لیکن میرا جتنا مطالعہ ہے اور میں نے کم سے کم تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو میں جو تذکرے پڑھے ہیں، اور جو تاریخ کی کتابیں پڑھی ہیں، ان میں ایک جملہ مجھے ایسا ملا ہے جس میں ایک کتاب ہی کا مضمون نہیں بلکہ اس میں ایک طوفان ہے، اور اس ایک جملہ نے وہ کام کیا ہے جو بڑی بڑی فوجوں نے، بڑی بڑی طاقتوں نے، بڑی بڑی سلطنتوں نے، اور بڑی بڑی ذہانتوں نے، اور بڑے بڑے عزم وارادہ نے وہ کام نہیں کیا۔

وہ فقرہ ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ لے کر جائیں، مجھے بعض مرتبہ کسی بین الاقوامی اجتماع میں جس میں عالم اسلام کے (کم سے کم) ممتاز ترین افراد جمع تھے، اور بڑے بڑے علماء اور مفکرین، اور بڑے بڑے اپنے ملک کے قائدین جمع تھے، مجھ سے آخر میں کہا گیا کہ میں کچھ عرض کروں، تو میں نے ان کی خدمت میں بھی وہی جملہ پیش کیا، میں نے کہا کہ آپ اتنے دن سے تقریریں سن رہے ہیں اور تقریریں کر رہے ہیں، اور اجلاس میں شریک ہیں، یہاں سے آپ کیا امانت لے کر جائیں گے؟ کیا پیغام لے کر جائیں گے؟ اور کس چیز کو اپنا رہبر بنائیں گے؟

وہ فقرہ حضرت صدیق اکبر کا فقرہ ہے، جس کا ترجمہ ممکن نہیں، اور اگر بہتر سے بہتر

زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ جوش، وہ درد اور وہ یقین کہاں سے آ سکتا ہے جو اس جملہ کے اندر ہے؟ اور جس جملہ نے کہا جا سکتا ہے کہ کایا پلٹ دی، بالکل انقلاب برپا کر دیا، اور اگر میں یہ کہوں کہ ہم اور آپ جس دین کے امین ہیں، جس دین کے حامل ہیں، اور جس دین پر عمل کر رہے ہیں، اور آج جو دین اسلامی اور شریعت اسلامی اس وقت روئے زمین پر ہے، اور جس کے نتیجہ میں یہ ہزاروں، لاکھوں مدارس قائم ہوئے ہیں، اور علوم شرعیہ کی تعلیم ہو رہی ہے، اور دین کے نام پر ہر زمانہ میں لوگ اپنی جانیں دیتے رہے، مال دیتے رہے، اور اپنی عزیز سے عزیز ترین متاع لٹاتے رہے، یہ سب اس جملہ کے سر ہے جس کے متکلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ بولنے والا، متکلم تو متکلم ہے، لیکن اس کے کلام نے وہ اثر کیا ہے جو بڑے بڑے زندہ انسان اور بڑے بڑے طاقتور سلاطین، اور بڑی فوجوں اور فوجی طاقتوں کے مالک نہیں کر سکے، یہ وہ جملہ ہے کہ جس وقت عرب کی سرزمین پر ارتداد پھیلنے لگا، اور ارتداد پھیلا اور طوفان کی طرح پھیلا، سیلاب کی طرح پھیلا، یہاں تک کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ اب اس دین کا اللہ ہی محافظ ہے، اب آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے، اور مدینہ طیبہ، جواثی اور طائف ایسے مقامات تھے کہ جہاں مسلمان سمٹ کر رہ گئے تھے، اور وہاں دین اپنی پوری شکل میں موجود تھا۔

اس وقت صدیق اکبر نے جو صحیح معنوں میں خلیفۃ الرسول تھے، اور آنحضرت (صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم) کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد حکمت الٰہی نے جس شخصیت کا انتخاب کیا، اس میں راز یہی تھا کہ سب سے پہلے اس دین کے محفوظ ہونے کی ضرورت تھی، امت کا درجہ بعد میں ہے، سلطنت کا درجہ اس کے بھی بعد میں ہے، اور معاشرے کا درجہ اس کے بھی بعد میں ہے، لیکن پہلے مسئلہ یہ تھا کہ دین محفوظ رہ جائے، اپنے صحیح عقائد کے ساتھ اور اپنی صحیح دعوت کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کا کلام محفوظ رہ جائے، اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو، تو یہ مزاج حضرت ابوبکر صدیق کا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے۔ یہ محض اتفاقی واقعہ نہیں، ﴿ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾[سورة الأنعام:۹۶] - حضور (ﷺ) کے بعد امت کو یہ الہام فرمایا، امت کو یہ توفیق دی اور اس کے دل میں یہ ڈالا، جس میں حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ)

سب سے آگے تھے کہ ان کو جانشین پیغمبر، خلیفۃ الرسول بنانا چاہیے۔

تو جب یہ ارتداد کی آگ پھیل رہی تھی، اور تین طرح کے لوگ تھے جیسے کہ امام خطابی نے 'معالم السنن' میں تجزیہ کیا ہے، کچھ تو وہ لوگ تھے جنھوں نے مطلق ارتداد اختیار کرلیا تھا، یعنی وہ کہتے تھے کہ ہم اس دین پر نہیں رہیں گے، ہم نے اس دین کا انکار کیا، کچھ وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کے منکر تھے، یعنی حکم زکوٰۃ کے، مسئلۂ زکوٰۃ کے، ان کا کہنا یہ تھا کہ زکوٰۃ کوئی چیز نہیں، ہم نہیں مانتے۔ کچھ وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کو مانتے تھے، لیکن یہ کہتے تھے کہ ہم بیت المال کو دینے کے پابند نہیں، ہم یہیں وصول کریں گے، اور اپنی صوابدید کے مطابق یہیں صرف کریں گے۔

لیکن پہلا گروہ جو تھا، وہ تو کھلا ہوا مرتد تھا، اور وہ دوسری نبوتوں کے پرچم کے نیچے، مسیلمہ کذاب کے جھنڈے کے نیچے، یا سجاح کے جھنڈے کے نیچے، یا طلیحہ کے جھنڈے کے نیچے آگیا تھا، اور دوسرا گروہ جو زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر تھا، اس نے بھی کفر اختیار کیا، لیکن تیسرا جو تھا وہ صرف یہ کہتا تھا کہ ہم زکوٰۃ کے قائل ہیں، زکوٰۃ ادا کریں گے، لیکن ہم اس کے پابند نہیں کہ ہم بیت المال کو دیں، تو حضرت ابوبکر صدیق اس وقت کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) کو جو بکری کے گلے میں باندھنے والا رسی کا پھندا دیتا تھا، جو اس کا بھی انکار کرے گا میں اس سے بھی لڑوں گا، اور 'عناقاً' کا لفظ کہا کہ جو ایک بکری کے بچہ کو بھی نہیں دے گا، میں اس سے بھی لڑوں گا۔

کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہوسکتی ہے؟

اس وقت ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا، وہ جملہ ایسا ہے کہ وہ ایک کتاب نہیں بلکہ ایک کتب خانہ پر بھی بھاری ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد اسلام کا بقا اور فرائض کا اپنی اصلی حالت پر رہنا، اور امت مسلمہ کا اس دین کو مضبوطی سے پکڑنا، ان سب میں اس جملہ کا اثر ہے، اس جملہ کا فیض اس میں شامل ہے، وہ کیا جملہ تھا؟ عربی کے تین چار لفظ ہیں، ایک جملہ ہے: "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" 'کیا دین میں کوئی کتر بیونت ہوسکتی ہے اور ابوبکر زندہ ہے؟ کیا ابوبکر کی زندگی میں دین کی زنجیر، دین کی طلائی زنجیر کی کسی کڑی، اس کے

کسی سرے کو کوئی توڑ سکتا ہے؟ کیا قرآن مجید کے کسی نقطے کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ میرے جیتے جی، میں زندہ ہوں اور میں یہ دیکھوں اپنی آنکھوں سے کہ دین کے ایک فرض کا انکار کیا جارہا ہے؟ ارتداد تو بڑی چیز ہے، ایک دین کے فرض کا، ایک نص قطعی، منصوص قطعی کا انکار کیا جارہا ہے؟ حیف ہے میری زندگی پر، یہ وہ کہہ سکتے ہیں، میں اس جملہ میں ان کے اس جذبہ کو ادا کررہا ہوں، کہ پھر میں کس لیے زندہ ہوں؟

غیرت صدیقی کے حاملین نے ہی اسلام کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا ہے

یہ وہ جملہ تھا جس کو تاریخ میں انھیں حرفوں کے ساتھ محفوظ کردیا گیا، میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اپنے عربی زبان کے مطالعہ اور تاریخ کے مزاج کو سمجھنے کی بنا پر، کہ اس میں بھی ذرا بھی کتر بیونت نہیں ہوئی، اس جملہ میں بھی یُنْقَصُ کا عمل نہیں ہوا، یہ دین تو بڑی چیز ہے، لیکن حضرت ابوبکر کی زبان سے نکلا ہوا جو جملہ تھا، اس جملہ میں غیرت صدیقی ایسی تھی، اور اس جملہ میں دل کا درد ایسا تھا، اس جملہ میں سلاست اور عام لوگوں کے سمجھنے کی صلاحیت ایسی تھی کہ مؤرخین نے اس کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش نہیں کی، اور میں دعوی کے ساتھ حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن و حدیث، صحیح حدیثوں کے علاوہ، قرآن تو قرآن اللہ کا کلام ہے، لیکن صحیح حدیثوں کے علاوہ اور احادیث کے دفتر کے علاوہ اگر کسی جملہ کے متعلق، کسی کے مقولے کے متعلق، کسی فانی انسان کے مقولے کے متعلق یہ ضمانت دی جاسکتی ہے، اور یہ ذمہ لیا جاسکتا ہے کہ وہ بالکل اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے، تو میں دعوی کے ساتھ کہوں گا کہ یہ جملہ ہے: "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" کسی مؤرخ کے ضمیر نے اجازت نہیں دی اور اس پر اس جملہ کا جو اثر ہوا ہوگا، اس نے اس کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس کا اپنی زبان میں کسی دوسرے جملہ کے ذریعہ ترجمہ کرے، یہ وہ جملہ ہے جس نے انقلاب عظیم برپا کردیا، یہ جملہ غیرت صدیقی کا مظہر ہے، اور اسی غیرت صدیقی نے اسلام کو (مسلمانوں کو نہیں) اسلام کو اس وقت تک باقی رکھا ہے، اسلام کو باقی رکھنے والی سلطنتیں نہیں تھیں، اسلام کو باقی رکھنے والی وہ طویل و عریض حکمرانی اور شہنشاہیاں، جو خلافت اموی کی شکل میں، خلافت عباسی کی شکل میں اور سلجوقیوں کی سلطنت کی شکل میں اور ترکمانی

عثمانیوں کی سلطنت کی شکل میں، اور مغلوں کی سلطنت کی شکل میں، اور آج یہ مصر و شام اور عراق، اور پھر یہاں تک کہ میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جزیرۃ العرب میں جب کبھی کوئی حکومت قائم ہوئی، جزیرۃ العرب کی نسبت کے باوجود بھی، یہ اُس کا فیض نہیں ہے، اس کا کارنامہ نہیں ہے کہ آج اسلام باقی ہے، یہ آج جو اسلام باقی ہے، اپنی اصلی شکل میں، وہ غیرت صدیقی کا نتیجہ ہے، اسی غیرت صدیقی کا حامل علماء کو ہونا چاہیے، اور اسی غیرت صدیقی کے حاملین نے اسلام کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھا ہے۔

میں آپ کے سامنے، علمائے کرام کے سامنے صرف تین واقعات کا انتخاب کرتا ہوں۔

امام احمد بن حنبلؒ اور فتنۂ خلق قرآن

ایک جب خلق قرآن کا فتنہ آیا اور مامون جیسے باجبروت بادشاہ نے یہ دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت روئے زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی (جسے امپائر کہتے ہیں)، وہ سلطنت عباسیہ تھی، سلطنت عباسیہ کے مطلق العنان فرمانروا مامون نے عقیدۂ خلق قرآن کی سرپرستی کی، میں اس کی اس وقت تشریح نہیں کر سکتا، آپ بہت دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، اور یہ ایک علمی بحث ہے، اس کو آپ تاریخ میں یا علم کلام کی کتابوں میں دیکھیے کہ اُس خلق قرآن کے عقیدہ کے کیا اثرات ہو سکتے تھے؟ ان میں سے ایک ادنیٰ اثر بتاتا ہوں جو سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک تھا، کہ یہ سمجھا جائے کہ حضور اقدس (ﷺ) کے قلب مبارک پر معانی نازل ہوئے، لیکن آپ نے ان معانی کو، ان مضامین کو اپنے الفاظ میں ادا کیا، تو خلق قرآن سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا تھا، تو یہ بہت فلسفیانہ اور دقیق کلامی بحث تھی، مامون نے اس کی سرپرستی کی، اور صرف سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ وہ اس کا وکیل بن گیا، اس کو اپنی عزت اور سلطنت کی طاقت کا نشان بنا دیا، علامت بنا دیا کہ اگر وہ لوگ اس کو نہیں مانتے تو گویا سلطنت سے باغی ہیں، اور میرے نافرمان ہیں۔

اس وقت اللہ کا ایک بندہ جس کا نام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ)، جو ائمۂ اربعہ میں سے ایک امام ہیں، اور اپنے زمانہ کے وہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں، امام بخاری وغیرہ

سب ان کے شاگرد ہیں، وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس کا انکار کیا، انھوں نے کہا: نہیں، قرآن مجید اپنے الفاظ کے ساتھ، اپنے معانی کے ساتھ، اپنے لفظوں کے ساتھ، ایک ایک حرف کے ساتھ کلام الٰہی ہے، اسی طرح نازل ہوا لوح محفوظ سے، اسی طرح قلب اطہر پر نازل ہوا اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے ادا کیا، اور ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ [سورة النجم: ٣-٤]

مامون کے بعد معتصم آیا، اس نے جلادوں کو بلایا اور ان جلادوں کو تیار کیا، اور امام احمد بن حنبل سے کہا: اے ابو عبد اللہ! اگر تم اس کے قائل ہوتے ہو تو میں ولی عہد کو ہٹا کر، ولی سلطنت کو ہٹا کر تم کو اپنے پہلو میں جگہ دوں گا، یہاں آ کر بیٹھو، اور اگر تم اس کے قائل نہیں ہوتے ہو تو یہ جلاد کھڑے ہیں، انھوں نے کہا: "أَعْطُونِي شَيْئاً مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ أَوْ سُنَّةِ رَسُولِهِ حَتَّى أَقُولَ بِهِ" میں کچھ نہیں جانتا، آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے سند لائیں، میں ابھی قائل ہوتا ہوں، اس نے جلاد کو حکم دیا، جلاد نے ایک کوڑا مارا، جلاد خود کہتا ہے کہ خدا کی قسم! اگر ہاتھی پر وہ کوڑا پڑتا تو چنگھاڑ مار کر کے بھاگتا، لیکن کوڑا کھانے کے بعد انھوں نے پھر کہا: "أَعْطُونِي شَيْئاً مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ أَوْ سُنَّةِ رَسُولِهِ حَتَّى أَقُولَ بِهِ"، دوسرے تازہ دم جلاد کو حکم ہوا، اس نے کوڑا مارا، اس طرح اتنے کوڑے ان کے لگائے گئے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے، بڑی مشکل سے سہارا دے کر ان کو سواری پر سوار کیا گیا، اور جیل بھیج دیا گیا، داستان لمبی ہے، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد واثق آیا، وہ اس میں ذرا نرم پڑا، اس کے بعد متوکل آیا، اس نے فرمان واپس لیا، اس وقت علماء میں یہ محضر پھرایا گیا تھا، اور چند علماء تھے امام احمد بن حنبل کے ہم مسلک اور ہم مزاج ان کے طریقہ پر، جنھوں نے محضر پر دستخط نہیں کیے، بہت سے علماء نے دستخط کر دیے، لیکن فتنۂ خلق قرآن فرو ہوا اور ایسا فرو ہوا کہ صرف تاریخ کی کتابوں کے اندر، اوراق کے اندر دفن ہو کر رہ گیا، اگر ہم ہی لوگ نہ بتائیں، اگر میں ہی آپ سے ذکر نہ کرتا، میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے مجمع میں شاید یہی علمائے کرام جو یہاں اسٹیج پر رونق افروز ہیں، یہ فتنۂ خلق قرآن سے واقف ہیں، اس اصطلاح سے، اس کے معانی سمجھتے ہیں، پورے مجمع میں شاید دس آدمی بھی نہیں ملیں جو خلق قرآن کیا ہوتا ہے، اور فتنۂ خلق قرآن کیا تھا، اور کب ہوا تھا، یہ اس کو

داستان پارینہ بنانے والا، اس کو کتابوں میں دفن کر دینے والا، اس کی دعوت کو دنیا میں قیامت تک کے لیے- میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں- مٹادینے والا، یعنی اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اور کتنے ہی فتنے آئیں، خلق قرآن کا فتنہ اب دنیا میں زندہ نہیں ہوگا، یہ کارنامہ امام احمد بن حنبلؒ کا تھا، جس کے لیے اس زمانہ کے لوگوں نے کہا کہ اَبُوْبَکْرٍ یَوْمَ الرِّدَّۃِ وَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ یَوْمَ الْمِحْنَۃِ، یہ دو بہت بڑے دین کے محافظ تھے اور انھوں نے آخری درجہ کی قربانی دی، اور آخری درجہ کی خدمت کی، حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فتنۂ ارتداد کے مقابلہ میں اور امام احمد بن حنبل نے فتنۂ خلق قرآن کے مقابلہ میں، تو وہ ایک خلیفۃ الرسول کی، ایک صدیق اکبر کی غیرت تھی، وہ ان کی شان اور ان کی سطح کے مطابق تھی، اور یہ ایک عالم دین کی غیرت تھی اور ایک محدث کی غیرت تھی، لیکن دونوں میں غیرت تھی، اس غیرت نے یہ پورا جو ایک جال پھیلا ہوا تھا، اور ہم آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیا تزلزل تھا بغداد کی مجلسوں میں، بغداد کی محفلوں میں، گھروں میں، درس کے حلقوں میں، جہاں پڑھے لکھے آدمی جمع ہوں وہاں، کوئی محفل شاید خالی ہوتی ہو اس پر تبصرہ کرنے سے، اور سب لرزہ براندام تھے، جو اہل غیرت تھے، جو دین کی حفاظت کرنا چاہتے تھے، وہ لرزہ براندام تھے کہ کیا ہوتا ہے؟ اور جو اس کے داعی تھے، وہ بھی متفکر تھے، ایک عالم کی غیرت نے، ایک عالم کی استقامت نے اس فتنہ کا خاتمہ کر دیا۔

تاتاریوں کا قبول اسلام

پھر میں تیسری چیز کا ذکر کرتا ہوں، تاتاریوں کا جب حملہ ہوا، تاتاریوں کے حملہ کا آپ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے، میں صرف ایک بات کہتا ہوں کہ تاتاری چین سے نکلے، اور وہ چینی ترکستان میں اور مشرقی ایشیا میں پھیل گئے، یہ ترکستان جو آج روس کے ماتحت ہے، پہلے اس میں پھیل گئے، اور سمرقند و بخارا ان کا نشانہ بنا، لیکن ان کے فتنہ کی ہولناکی کا یہ حال تھا کہ یوروپین مؤرخوں نے لکھا ہے کہ انگلستان کے ساحل پر مچھلی کا شکار کرنے والے مچھیرے جن کا ذریعۂ معاش یہی تھا، ماہی گیری تھی، وہ کئی ہفتے تک تاتاریوں کے ڈر سے نہیں نکلے، کہ کہیں تاتاری یہاں نہ آجائیں۔ جو دنیا کے نقشہ پر نظر رکھتے ہیں، جغرافیہ سے

واقف ہیں، کہاں یہ چین، کہاں یہ ترکستان اور ایشیا کا یہ مشرقی کنارہ، اور کہاں انگلستان کا وہ ساحل، لیکن ایسی ہولناکی تھی، ایسی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ وہ ہمت نہیں کرتے تھے، اور پھر اس زمانہ کی ایک مثل تھی، یہ آج تک عربی کی کتابوں میں محفوظ چلی آرہی ہے: 'إِذَا قِيلَ لَكَ إِنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوا فَلَا تُصَدِّقْ" ہر بات مان لینا، ہر ممکن الوقوع واقعہ پیش آسکتا ہے، لیکن کوئی تم سے کہے، کیسا ہی سچا آدمی کہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی، اس پر یقین نہ کرنا، تاتاری شکست کھانے والے ہیں ہی نہیں، تاتاری اور شکست! ناممکن ہے، دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں، وہ تاتاری کہ جن کا حال یہ تھا کہ ایک عورت چلی جاتی تھی سیکڑوں کے مجمع میں، اور مارنا شروع کرتی تھی، لوگ گردنیں جھکا دیتے تھے، پھر ان میں سے کوئی پکار کر کہتا کہ ارے! یہ عورت ہے، یہ تو خاتون ہے، تب لوگ کچھ سنبھلتے۔

اور یہ سب تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک مسلمان کے پاس سے گزرا، مسلمان اس زمانے کے سپہ گری سے واقف ہوتے تھے، ہمارے آپ کی طرح نہیں تھے، وہ اسلحہ بھی رکھتے تھے، وہ اپنا دفاع بھی کرسکتے تھے، ایک تاتاری ایک مسلمان کے پاس سے گزرا، اس سے کہا: دیکھو بھائی! میرے پاس اس وقت تلوار نہیں، اتفاق سے کوئی چھری چاقو نہیں، تم اس پتھر پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ، میں چھری چاقو لے کر آتا ہوں، تمھیں ذبح کروں گا، مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ اسی طرح سے دم بخود پڑا رہتا تھا، حرکت نہیں کرتا تھا اپنے قتل کے انتظار میں، یعنی بھاگ سکتا تھا، کہیں منھ چھپا سکتا تھا، درخت پر چڑھ سکتا تھا، ہمت نہیں تھی، یہ حالت تھی تاتاریوں کی کہ وہ ناقابل شکست سمجھے جاتے تھے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

آرنلڈ نے اپنی تاریخ "Preaching of Islam" میں صاف کہا ہے کہ کوئی دور سے دور کی پیشین گوئی بھی، ناقابل قیاس سے ناقابل قیاس بات بھی اس سے بڑھ کر نہیں تھی کہ تاتاری مسلمان ہوجائیں گے، سب کچھ ہوسکتے تھے، مسلمان نہیں ہوسکتے تھے، مسلمان ان کے نزدیک ایسے ذلیل تھے کہ اس وقت کی جو تصویریں ملی ہیں جو ماسکو اور لینن گراڈ کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ گھوڑے کی دم سے ایک مسلمان کی ڈاڑھی بندھی

ہوئی ہے، ایک مسلمان عالم کی ڈاڑھی بندھی ہوئی ہے اور وہ اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا چلا جا رہا ہے، اور وہ مسلمان اس کے ساتھ جا رہا ہے، اس کا کام تمام ہوگیا، یہ تصویریں ملی ہیں۔

تو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ ہر چیز کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی، لیکن اس کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ تاتاری اسلام قبول کریں گے، یہاں تک کہ اس نے لکھا ہے کہ اگر کچھ قیاس کہا جا سکتا تھا تو اتنا کہ تاتاری عیسائی ہو جائیں گے، اس لیے کہ ان کے محلوں میں، محل سراؤں میں مسیحی بیگمات تھیں، جو حسین و جمیل بھی ہوتی ہیں، جن کو انگلستان سے یا کہیں سے وہ لائے تھے، تو اگر وہ دین قبول کرتے تو عام طور سے اپنی بیویوں کے اثر سے، حرام سراؤں کے اثر سے، لوگ دین بھی بدل دیتے ہیں، اور اپنا تمدن بھی بدل دیتے ہیں، سب کچھ بدل دیتے ہیں، اس نے کہا کہ لیکن اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اسلام قبول کریں گے، میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جا سکتا، لیکن تاریخ نے یہ شہادت دی اور جیسا کہ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اسلام اپنے خاکستر سے بلند ہوا، اسلام جو خاکستر کے نیچے تھا، یعنی جل کر اور بجھ کر راکھ کے نیچے ہوگیا تھا، اس نے سر نکالا، سر اٹھایا، اور اس نے تاتاریوں کو مسلمان کر لیا، اور فاتح تاتاری اسلام کے مفتوح بن گئے، اور مفتوح مسلمانوں نے تاتاری فاتحوں کو اسلام میں کلمہ پڑھایا، اسلام کا حلقہ بگوش بنایا۔

یہ کس کا کام تھا؟ یہ صوفیائے کرام کا کام تھا، یہ ان باعزیمت مسلمان وزراء کا کام تھا، اور داعیان اسلام کا کام تھا جو خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے، اور تاتاریوں کو تبلیغ اسلام کرتے تھے، میں صرف ایک واقعہ سنا دیتا ہوں کہ ہمارے لیے بڑی عبرت کا واقعہ ہے، کہ ایران میں تاتاریوں کی جو شاخ تھی، تغلق تیمور اس کا ولی عہد سلطنت تھا، اور تاتاریوں کی ایک شاخ بغداد میں تھی، اور ایک بہت بڑی شاخ ایران میں تھی، جو ایران و ترکستان تک پھیلی ہوئی تھی، تو تغلق تیمور شکار کے لیے نکلا، اور شکاریوں میں کچھ توہمات ہوتے ہیں، آپ حضرات جانتے ہیں، جو شکار کھیلتے ہیں، ان میں سے ایک توہم یہ تھا کہ ہماری شکارگاہ میں ایرانی نہ آنے پائے، نہیں تو شکار نہیں ملے گا، ہم جب شکار کھیلنے نکلتے تو ہمارے زمانہ میں یہ تھا کہ چھری کا کوئی نام نہ لے، چاقو کا کوئی نام نہ لے، ورنہ شکار نہیں ملے گا، جمعرات کو شکار نہیں ملے گا، اور کئی ایسی چیزیں تھیں، یہ سب وہمی باتیں تھیں، لیکن تھیں، تو ان تاتاریوں میں یہ تھا کہ ایرانی سب

سے زیادہ ذلیل ہوتے ہیں، اور منحوس ہوتے ہیں، اگر ایرانی کہیں سے آ گیا تو شکار نہیں ملے گا، اللہ کو کچھ اور کرنا مقصود تھا، کچھ اور دکھانا تھا، شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے، شہزادے کی شکارگاہ راستہ میں پڑ رہی تھی، ان کو خبر نہیں تھی، وہاں اتفاق سے کوئی پہرہ نہیں تھا، پہرہ دار بھی کہیں کھانے پینے کے لیے ہٹ جاتے ہیں، غفلت برتتے ہیں، آج بھی ہوتا ہے پہلے بھی ہوتا تھا، تو وہاں کوئی پہرہ دار نہیں تھا، وہ اندر آ گئے، وہ بڑھتے چلے آئے، یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہرہ دار تھا، کہا کون؟ ایرانی؟ کہا: ہاں، اس کو پکڑا اور شہزادے کے پاس لے گیا، کہ دیکھیے ایک بدنصیب ایرانی یہاں آ گیا، اور شہزادے کو سخت طیش آیا کہ ساری محنت برباد ہوئی، سب پر پانی پھر گیا، یہ منحوس کہاں سے یہاں آ پڑا، اور اب شکار نہیں ملے گا، اس زمانے میں امراء کے پاس، بادشاہ کے پاس کتا ہوا ہی کرتا تھا، یہ واقعات آرنلڈ نے بھی Preaching of Islam میں لکھا ہے، اور اس سے بہتر انداز میں ترکی اور فارسی کتابوں میں ہے، جن سے میں نے اخذ کیا ہے، وہ میں آپ کو سناتا ہوں، جو ہماری فارسی کی قدیم کتابوں میں ہے کہ کتا اس کے پاس تھا، اسے غصہ میں کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے کہا کہ تم اچھے ہو کہ یہ کتا اچھا ہے؟ انھوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا (اور بالکل الہامی جواب تھا، اللہ نے الہام فرمایا) کہ ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، کہا: کیوں ابھی فیصلہ نہیں ہو سکتا؟ یہ کتا ہے، تم ایرانی ہو، تو یا یہ کہو کہ میں افضل ہوں، میں بہتر ہوں، تلوار تیار ہے گردن اڑانے کے لیے، یا یہ کہو کہ شہزادے کا کتا مجھ سے بہتر، بھلا میں شہزادے کے کتے کے مرتبہ کو کیا پا سکتا ہوں؟ انھوں نے کہا: میں ابھی نہیں کہہ سکتا، پوچھا: کب کہو گے؟ کہا: اگر ایمان پر خاتمہ ہوا تو میں افضل ہوں، اگر ایمان پر میرا خاتمہ نہ ہوا تو یہ کتا افضل ہے۔ بس اس کے دل پر ایک چوٹ لگی، پوچھا: ایمان کسے کہتے ہیں؟ کہا کہ ایمان یہ ہے کہ اپنے خالق کو پہچانے، اس دنیا کو پیدا کرنے والے کو جانے اور اس کو یہ سمجھے کہ وہ اکیلا ہے، اس دنیا کا کارخانہ چلا رہا ہے، اس کے پیغمبروں کو پہچانے، اور آخری رسول محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہچانے، اور آخرت کو مانے اور یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا ہے، اور حساب دینا ہے، اس نے سنا، ہونے والی بات یہ کہ بس اس کے دل پر ایک اثر پیدا ہوا، اس نے کہا: اچھا، اس وقت تو آپ چلے جائیے، اور پھر اشارہ کیا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، لیکن اگر آپ یہ سنیں کہ تغلق

تیمور جانشین ہوگیا اور اس کی تاج پوشی ہوگئی تو مجھ سے ملیے گا ضرور۔

اب وہ دن گننے لگے کہ کب وہ مبارک گھڑی آتی ہے کہ تغلق تیمور بادشاہ ہوتا ہے، اور میں اس کے پاس جاتا ہوں، اس کے دل پر اثر ضرور ہوگیا ہے، ایمان کی قیمت اس کے دل میں پیدا ہوگئی ہے، میں اس کی اور تشریح کروں گا، اور کلمہ پڑھاؤں گا، لیکن ان کا وقت آ گیا، تو انھوں نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ بیٹے، میرے فرزند! میری قسمت میں نہیں تھا کہ اتنی بڑی سعادت حاصل کروں، شاید خدا نے یہ سعادت تیری قسمت میں لکھی ہو، دیکھو جب سننا کہ تغلق تیمور بادشاہ ہوا اور اس کی تاج پوشی ہوگئی تو جانا اور میری بات یاد دلانا، چنانچہ وہ وقت آیا اور اللہ کو منظور تھا، وہ وقت آیا تو وہ گئے، اب ان کو وہاں کون جانے دیتا، ایسے کپڑے تھے ان کے اور پھر ایرانی اور باہر کے، باہر انھوں نے ایک درخت کے نیچے اپنا مصلی بچھایا، اور اذان دینے لگے، فجر کی اذان جب انھوں نے دی تو اللہ کو منظور تھا شہزادے کی آنکھ کھل گئی، حالانکہ شہزادے کیسی گہری نیند سوتے ہیں، اور کن محل سراؤں میں اور کن حفاظتوں میں سوتے ہیں، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا، کہا: یہ کیا بات ہے؟ یہ صدائے بے ہنگام کیا ہے؟ یہ کون صدا لگاتا ہے؟ کہا گیا: ایک مجذوب سا شخص ہے، دیوانہ آدمی ہے، ایک درخت کے نیچے کچھ بچھائے ہوئے کچھ پڑھتا ہے، کچھ جھکتا ہے، اٹھتا ہے، اور یہ آواز دیتا ہے، کہا: اس کو بلاؤ، بلایا، تو کہا: بھئی! تم کیا کہتے ہو؟ تم کون ہو؟ کہا: آپ کو شاید یاد ہو کہ شیخ جمال الدین ایک مرتبہ آپ کی شکار گاہ میں آ گئے تھے اور آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ تم بہتر ہو یا کتا بہتر ہے؟ تو انھوں نے کہا تھا کہ ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، اگر میرا ایمان پر خاتمہ ہوا تو میں بہتر ہوں، نہیں تو یہ کتا مجھ سے افضل ہے، تو میں آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں کہ ان کا ایمان پر خاتمہ ہوا، یعنی اس کا فیصلہ ہوگیا، اس نے کہا: میں کلمہ پڑھتا ہوں، اسی وقت کلمہ پڑھا، اور اس کے بعد وزیر اعظم کو بلایا، اور کہا کہ دیکھو میں نے تو فیصلہ کرلیا، میں اسلام قبول کرتا ہوں، تم اپنے متعلق سوچو، اس نے کہا کہ جہاں پناہ! میں تو بہت عرصہ سے مسلمان ہوں، آپ کے ڈر سے نہیں ظاہر کرتا تھا، بس جب بادشاہ اور وزیر اعظم مسلمان ہوجائیں تو پھر کیا، جس طرح لڑی ٹوٹتی ہے، جس طرح کوئی بندھ ٹوٹ جاتا ہے اور سیلاب آتا ہے، اس طرح سے پوری کی پوری تیموری شاخ نے جو ایران اور ترکستان میں تھی، سب کے سب نے اسلام قبول کیا۔

ایک تاریخ حقیقت

اور آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کی حقیقتوں میں سے یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تین قوموں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا ہے، پہلے عرب کہ عرب کلیۃً سو فیصدی مسلمان ہوگئے، اور اس کے بعد یہ تاتاری اور عثمانی ترک، انھوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا اور پھر کوئی ان میں سے کافر نہیں رہا، یا پھر افغانی، تو یہ پوری ایرانی شاخ مسلمان ہوئی، اور عراق کی تاتاری شاخ وہاں کے ایک مسلمان، نیک، صالح اور نہایت ہوش مند وزیر اعظم کی کوشش سے مسلمان ہوئے، پوری شاخ مسلمان ہوگئی، اور اقبال کا یہ شعر کہ

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانہ سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

یہ کس نے کیا؟ یہ اس وقت کے داعیان اسلام کی عزیمت نے، ان کے توکل علی اللہ نے، ان کے اس فیصلہ نے کہ نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ نہیں ہوگا کہ ہم تاتاریوں کے رحم وکرم پر رہیں، اور تاتاری اسلام کی دولت سے محروم رہیں، اور ہماری جان کی صرف امان ہو، اور ہم کھاتے پیتے رہیں، اور یہ ہم پر حکومت کریں اور یہ کافر دنیا سے جائیں، یہ چند باخدا اہل دل جن میں سے صرف ایک کا میں نے نام لیا ہے، کتنے اللہ کے بندے ہیں، لیکن تاتاریوں کو جن لوگوں نے اسلام پر آمادہ کیا، جن کی وجہ سے وہ اسلام لائے، ان کا اخلاص اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کے نام بھی تاریخ میں محفوظ نہیں رہے، انھوں نے اپنے ناموں کو چھپایا، یہ آخری درجہ کا اخلاص تھا۔

یہ تین واقعے ہیں جو عزیمت اور وہی غیرت صدیقی "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" کا نتیجہ ہیں، اللہ کے ایک دو چار دس بندوں نے اس زمانہ میں جن کی تعداد یقیناً آج ہمارے فضلائے مدارس سے اور چوٹی کے علماء سے کہیں کم تھی، یعنی ہم اس کو نہیں کہہ سکتے کہ ایک اور دس کی نسبت تھی، بلکہ ایک اور سو کی نسبت ہوگی، تعداد میں اور زبانوں کے جاننے میں، اور تفہیم کے طریقوں میں ماہر ہونے میں، اور نشر واشاعت کے وسائل کے مہیا ہونے میں،

اور ایک کتب خانہ کی موجودگی اور فراہمی میں ان اللہ کے بندوں کو آج کے فضلائے مدارس سے کوئی نسبت نہیں تھی، انھوں نے تاتاری جیسی قوم کو جنھوں نے عالم اسلام کو پامال کر کے، تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا، اور شہر کے شہر، خوارزم اور سمرقند جیسے شہر کھنڈر بنا کر رکھ دیے تھے اور انسانوں کے سروں کے مینارے بنا دیے تھے، ان کو جن لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور ان کو مسلمان بنایا، ان کی تعداد، ان کے وسائل، ان کے اثرات، اور ان کی مدد کرنے والی چیزیں بہت کم تھیں، اور آج کے زمانے میں آزادی کی جو سہولت حاصل ہے، آج ہر ایک کو اپنی بات کہنے کی جو آزادی ہے، اور آج دوسرے کو مشورہ دینے کی جو آزادی ہے، وہ اس وقت بالکل نہیں تھی، خاص طور پر جب کہ مسلمان اس درجہ مغلوب اور بے بس ہو گئے تھے، یہ تیسری مثال ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی غیرت ایمانی

چوتھی مثال حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے، ان کے دل پر ایک چوٹ لگی جب اکبر کو ایران کے ملحدوں نے یہ پٹی پڑھائی، کہ ہر مذہب کی عمر ایک ایک ہزار برس ہوئی ہے، مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، دین اسلام کی عمر بھی ایک ہی ہزار برس ہوگی، یہی خدا کے یہاں کا قانون ہے، وہ ایک ہزار برس گزر گئے، اب ضرورت ہے کہ نبی امّی کی جگہ شہنشاہ امّی لے، اور وہ اب قیادت کرے، اب وہ امت اسلامیہ کی قیادت کرے، اب نئے عہد کی قیادت کرے، وہ ایک نیا فکر دے، نیا مذہب دے، نیا قانون دے، اکبر خود اَن پڑھ تھا، اور مناظرے وغیرہ اس کے دربار میں ہوتے تھے، اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں، اکبر نے اس بات کو مان لیا اور اس کا داعی اور علم بردار ایسا بن گیا کہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا، یعنی ہر طرح سہولت تھی، خنزیر کا گوشت عام تھا، لیکن لحم بقر کا کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی سزا اکثر اوقات موت ہوتی تھی، اسی طریقے سے یہاں تک لکھا ہے کہ اس کے دربار میں کوئی حضور (ﷺ) کا نام نہیں رکھ سکتا تھا، اس کے چہرے پر پیشانی پر شکن آجاتی تھی، اگر کوئی پنے بیٹے کا نام محمد بتائے یا احمد

بتائے، اس درجہ اس کی اسلام سے نفرت بڑھ گئی تھی، اور میں آخری درجہ میں کہاں تک تفصیل کروں، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک مکتوب کی دو سطریں آپ کو سناتا ہوں، اس سے آپ سمجھیں کہ معاملہ کہاں تک پہنچ گیا تھا:

'وا ویلتاہ، واحسرتاہ، واحزناہ، محمد رسول اللہ کہ محبوبِ رب العالمین است، اتباع او ذلیل وخوار اند، ودشمنانِ او باعزت واعتبار۔'

'ہائے افسوس، مر جانے کی بات ہے اور غیرت میں دھنس جانے کی بات ہے کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) جو محبوب رب العالمین ہیں، ان کے پیرو، ان کے ماننے والے، ان کے راستے پر چلنے والے ذلیل وخوار ہیں، اور ان کے دشمن اس وقت اقتدار پر ہیں۔'

اکبر نے طے کر لیا کہ اس پورے ملک کا، اس پورے تحتی بر اعظم ہند کا رخ وہ برہمنیت کی طرف پورے طور پر کر دے گا، اور وحدتِ ادیان کو یہاں کا دین بنائے گا، اور اس میں ویدانت تہذیب اور ویدانت فلسفہ رائج ہوگا، اور وہ اس ملک کی پرانی تہذیب جو بالکل مردہ ہو چکی، اب از سر نو زندہ ہو، وہ اس کو دنیا کے ذہین ترین انسان اس کی مدد کے لیے مل گئے، ابو الفضل وفیضی کا نام آپ نے سنا ہوگا، بڑے عبقری اور جینئس انسان تھے، اس کے ساتھ ساتھ راجپوتوں کی طاقت تھی، اور سپاہ کی طاقت تھی، لیکن اللہ کا ایک بندہ کھڑا ہوتا ہے، اور وہ یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہوگا، یہ نہیں ہوگا، یہ دین نہیں چلے گا، یہ فتنہ باقی نہیں رہے گا، اور اس نے دربار اکبری کے جو بڑے بڑے اساطین تھے، ارکان سلطنت تھے، ان سے خط وکتابت شروع کی، تعلقات اور روابط پیدا کیے اور عام معاشرے میں وہ خیال پیدا کیا، اکبر کا طبعی وقت آ گیا، آگے چلنے کے بعد مؤرخ لکھتے ہیں کہ اخیر میں اس کے حالات بدل گئے تھے، اس نے سورہ یٓس پڑھوائی، اور ہو سکتا ہے ایسا کہ بابر کا پوتا اور انھیں مغلوں کا خون کہ جنھو ں نے اسلام کے نام پر ملک فتح کیا تھا، ان میں غیرت تھی، کوئی تعجب نہیں کہ اس کو یہ خیال ہوا ہو کہ ہمیں دھوکا دیا گیا، لیکن اکبر کا انتقال ہوا، اکبر کے بعد جہانگیر آیا۔

جہانگیر کے بعد، یہ خالص حضرت مجدد الف ثانی کا کارنامہ تھا، میں ایک مثال اس کی دیتا ہوں، بات پھر لمبی ہو گئی، کہ کانگڑہ کا قلعہ فتح ہوا، جو کبھی اسلامی تاریخ میں فتح نہیں ہوا تھا، محمود غزنوی سے لے کر، پہلے فاتح سے لے کر، عربوں سے لے کر کے اور جہانگیر تک کانگڑہ

کا قلعہ ایسا تھا کہ جو اسلامی سلطنت میں شامل نہیں ہوا تھا، جہانگیر نے اس کو بار بار فتح کرنے کی کوشش کی، بڑے بڑے مسلمان فاتح جو اس زمانہ میں خان اعظم کہلاتے تھے، خان خاناں کہلاتے تھے، بھیجے، لیکن ان کے ہاتھ فتح نہیں ہوا، آخر میں ایک راجپوت سپہ سالار کے ہاتھ سے وہ فتح ہوا۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب جہانگیر اس قلعہ میں گیا تو اس نے دو حکم سب سے پہلے نافذ کیے، اس سے آپ اس انقلاب کا اندازہ کریں، اکبر اور جہانگیر کے درمیان جو فاصلہ ہو گیا تھا، اس فاصلہ کو آپ ناپ سکتے ہیں، اس نے کہا سب سے پہلے یہاں مسجد بنائی جائے، دوسرا حکم دیا کہ یہاں گائے ذبح کی جائے، آپ خیال کیجیے کہ ایک راجپوت جرنل کے ہاتھ سے قلعہ فتح ہوتا ہے، تو کم سے کم احسان مندی کا تقاضا یہ تھا کہ اگر یہ کام کرنا تھا، تو اس کے سامنے نہ ہو، اس کے علم میں نہ آئے، بعد میں ہوتا رہے گا، لیکن اب اس کے اندر وہ ایمانی غیرت آ گئی تھی کہ وہ ایک منٹ کی تاخیر کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، یہ فیض تھا حضرت مجدد الف ثانی کا، جن کو اس نے تکلیف دی کہ آپ میرے ساتھ لشکر میں رہیں، مجھے فیض پہنچے گا، آپ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں، چنانچہ ان کے مکتوبات میں ذکر ہے، تراویح پڑھنے کا ذکر ہے، رات کو قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، اور بادشاہ پر اثرات پڑنے کا ذکر ہے، تدریجی طور پر، یہاں تک کہ بادشاہ ان کا معتقد ہوا اور اس کے اندر اتنا بڑا انقلاب آیا۔

پھر بادشاہ جہانگیر کے بعد شاہجہاں آیا کہ وہ شاہجہاں، جب وہ تخت طاؤس پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے یہ بات کہی کہ فرعون ایک سفیہ، ناسمجھ اور سبک سر اور اوچھا آدمی تھا کہ آبنوس کے تخت پر بیٹھا اور خدائی کا دعویٰ کیا، میں رسول اللہ (ﷺ) کی امت کا ایک فرد ہوں، رسول اللہ (ﷺ) کا ایک امتی ہوں، اتر کر اس نے سجدہ کیا، اور پھر شکرانہ کی نماز پڑھی، اور کہا: میں مسلمان ہوں، یہ شاہجہاں تھا۔

شاہجہاں کے بعد کون آیا؟ محی الدین اورنگ زیب آئے، جن کو ہمارے بعض بہت اچھے باخبر اور بڑے وسیع المطالعہ عرب ادیبوں اور مؤرخوں نے سادس الخلفاء الراشدین کا خطاب دیا ہے، شیخ علی الطنطاوی بار بار لکھتے ہیں کہ اگر کوئی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد چھٹا خلیفۂ راشد کہلا سکتا ہے تو وہ اورنگ زیب عالمگیر ہے، یہ سب کس کا فیض تھا؟ یہ حضرت مجدد

الف ثانی کا فیض تھا، اور دراصل کس کا فیض تھا؟ غیرت ایمانی کا فیض تھا، اور عزیمت مردانہ کا فیض تھا، اور اس قوت ایمانی کا فیض تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے امت کا رشتہ دین سے منقطع ہو؟ ملت کا رشتہ دین سے منقطع ہو؟ وہ اپنی شریعت سے، شریعت پر عمل کرنے سے مجبور کردی جائے؟ وہ اپنے شرعی عائلی قانون پر عمل نہ کر سکے؟ وہ میراث کو شرعی طریقہ پر تقسیم نہ کر سکے؟ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم نہ دے سکے؟ وہ ان کو اپنے دین کے شعائر کا پابند نہ بنا سکے؟ نماز روزہ کا پابند نہ بنا سکے؟ اور ان کے عقائد کو اسلام کے مطابق نہ بنا سکے؟ وہ دینی طور پر بھی ارتداد کا راستہ اختیار کرلیں، اور معاشرتی طور پر، تہذیبی طور پر بھی اور ثقافتی طور پر بھی؟

غیرت صدیقی پیدا کیجیے!

ساری باتیں آج بھی آپ نے سنیں، بڑی اچھی سے اچھی مؤثر تقریریں سنیں، آپ نے مضمون سنا، اور کل بھی آپ سنیں گے، اور ان شاء اللہ پرسوں بھی سنیں گے جو رہیں گے، لیکن میں ایک نکتہ کی بات ہزار باتوں کی ایک بات آپ سے کہتا ہوں جس کو آپ لے کر جائیے کہ "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" آج یہ ملت اسلامیہ بحیثیت ملت کے، اور مدارس بحیثیت ایک مجموعۂ مدارس کے، ایک مکتب خیال کے، اور ایک پوری نوع کے اور جنس کے، اور پھر الگ الگ ہر مدرسہ اور الگ الگ مدرسہ کا فاضل جو مدرسہ سے پڑھ کر نکلا ہے، اس کے لیے جو چیز حالات میں تغیر پیدا کرسکتی ہے، میں آپ کو ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے، ایک جہاں گرد اور جہاں بیں انسان کی حیثیت سے، کہ کم ملک اس کے معائنہ سے اور اس کی ذاتی واقفیت سے خارج ہوں گے، مختلف مذہبوں کے، مختلف مکاتب خیال کے اور دانشوروں کی کتابیں پڑھنے والے انسان کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں، صرف میں ایمان بالغیب کے طور پر نہیں، ایمان بالغیب تو اصل ہے، لیکن میں بالکل فکری طور پر، عملی طور پر، اور ذہنی طور پر مطمئن ہوں کہ اگر کوئی چیز یہاں صورت حال میں تبدیلی پیدا کرسکتی ہے، تو وہ ہے: "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" کا جذبہ، کہ ہمارے ہوتے ہوئے اتنے فضلاء جس ملک میں موجود ہوں، اتنے مدارس اس ملک میں موجود ہوں، وہاں اردو مٹ جائے؟ وہاں یہ معلوم نہ ہو کہ اسلام اور مسلمان کس طرح زندگی گزارتا ہے؟ وہاں جو مسلمانوں کے تہذیب کی

جوخصوصیات تھیں، پردہ تھا، حیا اور عفت تھی، اور بڑوں کا ادب تھا، اور انسان کا احترام تھا، اور خدا پرستی تھی، زر پرستی کے بجائے خدا پرستی تھی، وہ ملت ایسی ہو جائے کہ نہ اس کے ممیّز عقائد،، نہ امتیازی عقائد، نہ اس کی امتیازی تہذیب، نہ اس کی امتیازی معاشرت، نہ اس کی امتیازی ثقافت، حال یہ ہو جائے کہ نواسے اور پوتے، اپنے نانا اور دادا کو نہیں بلکہ بیٹے اپنے والدین کو ہندی اور انگریزی میں خط لکھنے پر مجبور ہوں، اس لیے کہ ان کو اردو نہیں پڑھائی گئی، اتنی بڑی ملت، اتنی تعداد میں فضلاء، اتنی تعداد میں مدارس کے ہوتے ہوئے اس ملک سے اردو مٹ جائے؟ یہ ایک چیستاں ہوگی، ایک پہیلی ہوگی آئندہ کے مؤرخین کے لیے، جس کو وہ بوجھ نہیں سکیں گے، اور اس کی کوئی تشریح نہیں کر سکیں گے کہ کس نے یہ اردو زبان مٹائی؟ یہ حکومت مٹا سکتی ہے جب تک کہ خود اس کے ساتھ انسانوں کا فیصلہ، انسانوں کی رضا مندی، اور انسانوں کا اس کو تسلیم کر لینا، یا اس کے سامنے سپر ڈال دینا نہ ہو؟

تو میں ساری ذمہ داری اس وقت ملت اسلامیہ پر ڈالتا ہوں، اور خصوصیت کے ساتھ فضلائے مدارس پر ڈالتا ہوں، اور ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی دولت دی ہے، کہ اگر اس ملک میں دین کا کوئی شعبہ — خدانخواستہ — زوال کی نذر ہوا، انقلاب کا نذر ہوا، تو اس کی ذمہ داری میں باوجود اس کے کہ مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، اور جو مجھے جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ بڑے بڑے لوگوں سے، سلاطین سے بھی، الحمد للہ جن سلاطین سے مجھے ملنا ہوا، ان سے بھی میں نے بالکل برابر کی سی گفتگو کی، لیکن میں اسے انصاف کا تقاضا سمجھتا ہوں کہ میں اس کی ذمہ داری حکومت پر نہیں، اس ملت اسلامیہ پر ڈالتا ہوں، ان فضلائے مدارس پر ڈالتا ہوں جن کے اندر "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟" کی غیرت نہیں ہے، اور یہ جذبہ نہیں ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کیسے یہاں دینی ارتداد، تہذیبی ارتداد، معاشرتی ارتداد اور ہمہ گیر ثقافتی ارتداد آ سکتا ہے؟ کہ سارا ہمارے بزرگوں کا جو اندوختہ، ذخیرہ اور کارنامہ ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی کے بعد سب سے بڑا دین کا ذخیرہ اور سب سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں اور دین کی تشریحات اور بعض تو وہ کہ جن کی عربی میں مثال ڈھونڈھنے سے شاید ملے گی، بے شک عربی عربی ہے، وہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، اور رسول اللہ (ﷺ) کی زبان ہے، صحابہ کرامؓ کی زبان ہے، لیکن ایسا ہے کہ یہاں ہندوستان کے

عالموں نے عربی میں ایسی کتابیں لکھی ہیں کہ جن کی مثال عرب ملکوں میں نہیں ملتی، یہ تو میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، حجۃ اللّٰہ البالغۃ کی مثال باہر نہیں ہے، ایسی اور کتنی کتابیں ہیں کہ نام لینا اس وقت مشکل ہے، اور بہت سے لوگ ان کو جانتے بھی نہیں، لیکن اس کے بعد اردو میں جو ذخیرہ ہے، حدیث کی تشریحات کا جو ذخیرہ ہے، سیرت نبوی پر کتابوں کا، علم کلام پر کتابوں کا، اور دینیات کی کتابوں کا، اور تاریخ کا، یہ کسی زبان میں نہیں، یہاں تک کہ فارسی میں بھی نہیں ہے، یہ سب ذمہ داری آپ کی ہے۔

اور بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے اور آپ کے اندر کسی درجہ میں، کسی نسبت کے ساتھ، کم سے کم درجہ میں بھی حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اس غیرت کا کچھ حصہ آجائے، جس نے دین کو بچالیا، اور آج ہم سب اُسی دین کے سایہ میں ہیں، اُسی دین کو پکڑے ہوئے ہیں جو ابوبکر صدیق کی اس عزیمت کا اور اس غیرت ایمانی کا نتیجہ تھا، ہمارے اندر کسی درجہ میں یہ بات پیدا ہو، ہر مسئلہ حل ہے، ہر مشکل آسان ہے، ہر ناممکن بات ممکن ہے، کوئی چیز بھی یہاں، بڑی سے بڑی طاقت یہاں کچھ بھی نہیں کرسکتی، اگر آپ کے اندر آج بھی غیرت پیدا ہوجائے، ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ دین پڑھائیں؟ ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ اردو سکھائیں؟ اپنے بچوں کو پہلے دین کے عقائد بتائیں گے، ان کو مسلمان بنائیں گے، پیغمبروں کے حالات سے آشنا کریں گے، رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت سے ان کو واقف کرائیں گے، اور ان کو کلمہ سکھائیں گے، اور ان کو نماز سکھائیں گے، اور اگر اس کے بعد ان کے کیریر میں فرق آتا ہو، آئے سو بار آئے، لیکن ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ ہمارے گھر کے بچے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب نے کہا کہ باپ تہجد گزار اور ذاکر شاغل، بیٹا یا پوتا فرشتوں کا منکر، وہ آسمانوں کا منکر، وہ معراج کا منکر، یہ ہورہا ہے، انھوں نے ایک گھر کی مثال دی، سیکڑوں گھر اس وقت مسلمانوں میں ایسے ہوں گے کہ جہاں ایک نسل تہجد گزار اور ولی صفت ہے، اور دوسری نسل کا ایمان خطرہ میں ہے۔

نسل نو کے ایمان کی فکر کیجیے!

اور میں نے جیسے کہ بڑے بڑے تبلیغی اجتماع میں کہا، اور پھر کہتا ہوں اور اس لیے کہتا

ہوں کہ بات سچی ہے اور ہر جگہ کہی جاسکتی ہے، کہ اگر آپ کی موجودہ نسل پوری کی پوری ولی بن جائے، میں نہیں کہتا کہ تہجد گزار بن جائے، میں نہیں کہتا کہ دو دو چار چار حج کر آئے، بلکہ ولی بن جائے، صحیح معنی میں، تب بھی کافی نہیں ہے جب تک کہ آپ اپنے بچوں کو کسی درجہ میں مسلمان نہ بنالیں، اور اس کا اطمینان نہ کرلیں کہ آپ کے بعد وہ جیسے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کہا تھا، اور لکھنؤ کے اسی دینی تعلیمی کنونشن کا اختتام میری ہی تقریر پر ہوا، اور شاید اس وقت کا اجلاس بھی میری ہی تقریر پر ختم ہو، وہاں میں نے دیہات سے آئے ہوئے مجمع میں جو ہزاروں کی تعداد میں تھا، میں نے کہا کہ یہ کیا لے کر جائیں گے؟ یہ تجاویز جو قانونی زبان میں لکھی گئیں، اور پڑھی گئی ہیں، اور یہ قانونی نکتہ آفرینیاں اور یہ اس کے مباحث کہاں ان کی سمجھ میں آئیں گے؟ یہ کیا کہیں گے اپنے گھر جا کر کہ ہم کیا سن کر آئے؟ میں نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیت پڑھی، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا مفتی عبد العزیز صاحب نے اس آیت سے پہلے کی آیت پڑھی تھی، اور میں اس کے بعد کی آیت پڑھتا ہوں: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم. ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي، قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَآئِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهاً وَّاحِداً وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾[سورة البقرة:۱۳۳] کہ یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور اس وقت کی جو عمریں ہوتی تھیں، برکت ہوتی تھی نسل میں، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پرپوتے بھی ہوں گے، اور پرنواسے بھی ہوں گے، سب کو جمع کیا، اور یہ کون ہیں؟ جنھوں نے جب آنکھ کھولی، بلکہ آنکھیں کھولی بھی نہیں تھیں کہ اللہ کا پاک نام ان کے کانوں میں پڑا تھا، جنھوں نے اللہ کے نام، اللہ کی توحید، اللہ کی وحدانیت کے سوا اپنے گھر میں کچھ سنا نہیں تھا، جنھوں نے بلوغ سے پہلے سے نمازیں پڑھنی شروع کردی ہوں گی، اور یہ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے، جنھوں نے سوائے پیغمبروں کے قصوں کے، سیدنا ابراہیم کے، بناءِ کعبہ کے، اور ذبحِ اسماعیل کے قصے کے، اور آتشِ نمرود میں کود جانے کے قصہ کے، اور اس کے گل وگلزار بن جانے کے قصے کے، اور شرک کا انکار کرنے اور ﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَداً حَتّٰى تُؤْمِنُوا

بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ﴾ [سورۃ الممتحنۃ: ٤] کہ ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کی دشمنی آگئی، انھوں نے مشرکین سے کہا کہ ہم تمھارے منکر ہیں، اور ہم ان کے بھی منکر ہیں جن کے تم بڑے قائل اور جن کی تم بڑی پرستش کرتے ہو، انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سنا تھا، ان سے حضرت یعقوب (علیہ السلام) پوچھتے ہیں اور کہتے ہیں، یہ ہے غیرت ایمانی! یہ ہے غیرت نبوی! پیغمبرانہ غیرت، پیغمبرانہ جذبہ! کہ کہتے ہیں کہ میرے بیٹو، پوتو، نواسو! میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی، میں دنیا میں اطمینان سے نہیں جاؤں گا جب تک کہ یہ نہ سن لوں، تم یہ نہ بتادو، تم اطمینان نہ دلادو کہ میرے بعد تم کس کی پرستش کروگے؟

میں نے کہا کہ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ قرآن مجید نے اتنا بھی گوارا نہیں کیا کہ ان کے سوال اور ان کے جواب کے درمیان کوئی چیز بھی حائل ہو، اس لیے کہ یہ غیرت خداوندی کے خلاف ہے، جب انھوں نے کہا: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ ﴾، فوراً قول نقل کیا کہ ﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ ﴾، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے درمیان کوئی گفتگو ہوسکتی ہے، وہ کیا ہوئی ہوگی؟ کہا: ابا جان، دادا جان، نانا جان، یہ بات بھی پوچھنے کی ہے؟ ہم سے آپ پوچھ رہے ہیں؟ ہمیں آپ نے سکھایا کیا؟ ہمیں آپ نے پڑھایا کیا؟ اور ہم نے اس گھر میں سوائے خدائے واحد کی پرستش کے دیکھا کیا؟ آپ ہم سے پوچھتے ہیں؟ لیکن:

عشق است و ہزار بدگمانی

یعقوب علیہ السلام کو قرار نہیں آیا۔

آج یہ چیز آپ کے اندر ہونی چاہیے، کتنے ہیں آپ میں سے کہ جنھوں نے ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ ﴾ اپنے بچوں سے کبھی پوچھا ہے؟ اردو میں پوچھیے، اور اپنی اپنی زبانوں میں پوچھیے، اور اشاروں سے پوچھیے، اور اس کے سن کے مطابق پوچھیے، لیکن کیا آپ نے کبھی اس کی ضرورت سمجھی یا سمجھ رہے ہیں کہ سب سے زیادہ ضروری بات، جو ایک مسلمان کو اس دنیا میں جانے سے پہلے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے، اور جس کو وہ سننا چاہتا ہے، وہ یہ ہے، اور جس کو وہ معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ اطمینان ہے کہ میرے بعد میری اولاد خدائے

واحد ہی کی پرستار ہوگی، اور وہ اسی دین آخر، دین خاتم، دین افضل واشرف اسلام- ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾[سورة آل عمران:۱۹] "اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر دین صرف اسلام ہے"- اس دین کی پابند ہوگی۔

آپ کا سب سے بڑا فرض

بس اس سارے کنونشن کا - میں سمجھتا ہوں- حاصل یہ ہے، اس کی کامیابی کا راز، اس کی کامیابی کی علامت یہ ہے کہ آپ کچھ اور سمجھیں یا نہ سمجھیں، بڑی لمبی داستان ہے، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ﴾ کہ آپ یہاں سے یہ سبق لے کر جائیں کہ سب سے بڑا فرض آپ کے لیے یہ ہے، اور ملت اسلامیہ کی دین اسلام سے وابستگی اور ربط وتعلق اور اسی پر جینے اور مرنے کی ضمانت صرف اس میں ہے کہ اس وقت کا ہر آدمی اپنی آئندہ نسل کے فرد سے، اپنے بچے سے، اپنے پوتے اور نواسے سے یہ پوچھے کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اور اس پوچھنے کا حق اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ آپ نے اس کو دین کی تعلیم نہ دی ہو، آپ کس منھ سے اس سے پوچھیں گے؟ اگر وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ آپ نے ہمیں کب سکھایا تھا؟ ﴿رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَأَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾[سورة الأحزاب:٦٧] انھوں نے اگر آپ کے سامنے، آپ کے منھ پر یہ کہہ دیا، آپ تو جب پوچھ سکتے ہیں جب خدائے واحد کی عبادت کا طریقہ آپ نے ان کو سمجھایا ہو یعقوب (علیہ السلام) کی طرح، تب تو وہ کہیں گے: ﴿نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَإِلٰـهَ آبَائِكَ﴾، اور اگر دو دو تین تین پشتیں گزر گئیں کہ انھوں نے نہ خود خدائے واحد کی عبادت کی، اور نہ عبادت کی تعلیم دی، تو کس منھ سے کہیں کہ ﴿نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَإِلٰـهَ آبَائِكَ﴾؟ نہ وہ ہمارے، نہ ہم نے اس خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھا، اور نہ اس نے جو نسلیں دیکھیں، ہم سے اوپر اپنے دادا کو دیکھا، نانا کو دیکھا، نہ انھوں نے، تو آپ کو نہ یہ پوچھنے کا حق ہوگا، نہ ان کو یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ﴿نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَإِلٰـهَ آبَائِكَ﴾۔

گھروں کی فضا دینی بنائیں!

بس اس پورے کنونشن کا پیغام آپ جو لے کر جائیں، وہ یہ ہے کہ اپنے گھروں کی اپنے خاندانوں کی، اپنے محلوں کی، اپنے قصبات اور گاؤں کی، اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی ذمہ داری آپ پر ہے، آپ ان کی فکر کریں، آپ ان کی دینی تعلیم کا انتظام کریں، ان کو مکتب میں بھیجیں، چاہے اسکول میں بھیجیں، لیکن ایک شبینہ یا صباحی مکتب ہو، اس میں بھیجیں، اور ان کا اتنا وقت نکالیں کہ وہ وہاں جا کر قرآن مجید پڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں، اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن شریف پڑھ سکیں، اور باقاعدہ قرآن شریف بھی پڑھیں، اس کے بعد دین کی بنیادی باتیں ان کو بتائی جائیں، اور گھر میں بھی تذکرہ ہو تو توحید کا تذکرہ ہو، انبیائے کرام کا تذکرہ ہو، بجائے سیاسی باتوں کے، اخبارات آپ پڑھتے ہیں، دن بھر اس پر رائے زنی کرتے ہیں، بچہ دیکھتا ہے کہ قرآن مجید سے پہلے جو چیز ہمارے ہاتھ میں آتی ہے، وہ اس دن کا اخبار ہوتا ہے، جو زیادہ پڑھے لکھے ہیں ان کے ہاتھ میں انگریزی اخبار ہوتا ہے، اور جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں ان کے ہاتھ میں اردو اخبار ہوتا ہے، گھر میں تذکرہ سنتے ہیں تو یہاں کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا، اور یہاں کی حکومت کے بڑے بڑے ارکان کا، اور یہاں کی بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں کا، یا یہاں کے بڑے بڑے کاروبار اور بنکوں کا، اور کمائی کے جو طریقے ہیں، اور کیریر بنانے کے جو راستے ہیں، ان کا تذکرہ ہوتا ہے، گریجویٹ ہو، فلاں ہو، اور انجینئرنگ کمپٹیشن میں یہ پیدا کرو، اور فلاں چیز میں ٹاپ کرو، اور تم اس میں اول نمبر آؤ تو تم کو پھر یہ نوکری ملے گا، سارا ماحول ہمارے گھروں کا یہ ہے، ضرورت یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں دینی ماحول ہو، انبیائے کرام کے واقعات سنائے جائیں، قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرائی جائیں، جیسے ہمارے بچپن میں خدا کے فضل سے دینی خاندانوں میں ہوتا تھا، وہاں تو جہاد اور شہداء کی باتیں ہوتی تھیں، وہاں تو نانیاں اور مائیں اپنے بچے کو یہ کہہ کہہ کر سلاتی تھیں، میرے والد کے ایک دوست نے بتایا کہ آپ کے والد صاحب کہتے تھے کہ ہماری نانی صاحبہ جب ہم کو سلاتی تھیں تو مومن خاں کا یہ شعر پڑھتی تھیں، مومن خاں

سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید تھے، اور یہ گھرانہ بھی سید صاحب کا تھا، تو ہماری نانی صاحبہ جب ہمیں سلاتی تھیں تو پیار سے تھپکی دیتی تھیں اور کہتی تھیں:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

آپ خیال کیجیے کہ نانی یہ چاہتی ہے کہ بیٹے کی عمر عمرِ نوح ہو، خضر کی عمر ہو، اس وقت بیٹے کے کان میں یہ ڈال رہی ہے کہ شہادت سب سے بڑا درجہ ہے، اگر بیٹے کی جوانی میں شہادت کا میدان، جہاد کا رخ اختیار کر گیا تو معلوم نہیں کہ اس کی کیا عمر ہوگی، لیکن ان کو سب گوارا تھا، ان کا یہ ایمان تھا کہ یہ سب سے بڑی سعادت ہے۔

بس اس وقت ضرورت ہے اپنے گھروں کی فضا بنانے کی، محلوں کی فضا بنانے کی، اور قصبہ قصبہ مکاتب اور مدارس قائم کرنے کی، میں صفائی سے کہتا ہوں عربی خوانوں سے کہتا ہوں، میں نے اپنے یہاں بھی کہا، کہ آپ کے کام کرنے کی جگہ یہ بلادِ عربیہ نہیں ہیں، جہاں اپنے استادوں سے دس گنا اور بیس گنا، پچاس گنا تنخواہ ملتی ہے، میں سب جانتا ہوں، میں گویا ایک طرح سے وہاں کا شہری ہوں، وہ میرے لیے ایسے ہی ہیں جیسے آپ کے لیے آپ کے محلے ہوں گے، میرے لیے۔ الحمدللہ۔ وہ شہر و دیار ایسے ہیں، اور وہاں کے مناصب بھی ایسے ہیں، میں صاف کہتا ہوں کہ آج بہت بڑی آزمائش فضلائے مدارس کے لیے آ گئی ہے کہ جہاں عربی پڑھی اور کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئے، ترجمانی کے قابل ہوئے، بجائے یہاں مکتب قائم کرنے کے، اور بجائے یہاں پیٹ پر پتھر باندھنے کے، یا آدھا پیٹ کھانے کے، اور یہاں کے ایمان کی حفاظت کرنے کے، وہ بلادِ عربیہ چلے جاتے ہیں تاکہ وہاں سے روپیہ بھیج کر یہاں عمارتیں بنوائیں، اور وہاں بھی زندگی کا لطف اٹھائیں، اور یہاں آئیں تو یہاں اتنا پس انداز ہو۔

بس صرف فضلائے مدارس اگر اپنے ذمہ لے لیں کہ ہم یہاں سے نکلنے کے بعد دعوت کا کام کریں گے، اپنے اپنے ذوق کے مطابق، اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق، اور مکاتب و مدارس قائم کریں گے اور دینداری کی فضا پیدا کریں گے تاکہ وہ اپنی نسل سے پوچھ سکیں کہ

﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ﴾ اور تاکہ وہ نسل انھیں الفاظ میں جواب دے سکے: ﴿نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَإِلٰـهَ آبَائِكَ﴾، بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، میرا ارادہ اتنا بھی نہیں تھا، اپنی صحت کے لحاظ سے بھی اس حال میں نہیں تھا، لیکن بات ایسی آگئی ذہن میں، اللہ تعالیٰ نے ڈالی کہ أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَ أَنَا حَيٌّ؟۔

یہ اپنے دل پر لکھ کر لے جائیے، یہ جملہ آپ کا محاسبہ کرے، اور دیکھنے والا آپ سے اس جملہ کے ذریعہ محاسبہ کرے کہ دین کا نقص منظور ہے، دین کا انحطاط منظور ہے، دین کے بخیہ ہونا، (معاذ اللہ) اور ٹکڑے ہونا آپ کو منظور ہے کہ آپ کو اپنی روزی کو، اپنے آرام کو، اپنے مستقبل کو، اپنی اولاد کے مستقبل کو مشکوک بنانا، خطرے میں ڈالنا منظور ہے؟ اگر آپ نے دوسرا راستہ اختیار کیا، تو دین بھی رہے گا، ملت بھی رہے گی، اور آپ بھی زیادہ عزت کے ساتھ رہیں گے، میں صاف اعلان کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُس سے زیادہ آپ عزت کے ساتھ رہیں گے، بلکہ آپ اس ملک کی قیادت کریں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو پھر اس ملک کی قیادت کرنے کا منصب عطا فرمائے گا، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

---

(۱) ۱۰/مئی ۱۹۸۹ء کو مظفر نگر میں منعقد دینی تعلیمی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں علماء کے ایک منتخب مجمع میں کی گئی تقریر، یہ تقریر اب قلمبند کرنے کے بعد شائع کی جارہی ہے۔

دینی تعلیمی تحریک کا پیغام اور علماء کی ذمہ داریاں

سب سے بہتر الوداعی کلمات

حضرات! اس جلسہ کے اختتام کے موقع پر میرے ذہن میں جو بہت سی چیزوں کا مخزن ہے، بلا کسی معذرت کے کہتا ہوں کہ اس سے بہتر رخصت کرنے کے لیے، اور خود دعا کے لیے، اور تلقین کے لیے، اور پیغام دینے کے لیے، اور اپنے فرض کا احساس کرنے کے لیے، اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے پوری تحریکی تاریخ میں، دعوتی تاریخ میں، اصلاحی تاریخ میں، علمی تاریخ میں اور ادبی تاریخ میں اس سے بہتر الفاظ نہیں ملتے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منقول ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کسی کو رخصت فرماتے تھے تو کہتے تھے: أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ ۔ یہ بالکل معجزانہ الفاظ ہیں، جب مسافر رخصت ہوتا ہے تو اس کی صحت کا معاملہ بھی ہوتا ہے، اس کے سامان سفر کا معاملہ بھی ہوتا ہے، وہ اپنے پیچھے گھر کے جن افراد کو چھوڑ کر جا رہا ہے، ان کا معاملہ بھی ہوتا ہے، اس کے مقاصد سفر کا معاملہ بھی ہوتا ہے، یہ سب چیزیں متقاضی ہیں، تقاضا کرتی ہیں کہ ان کے متعلق بھی دعا کی جائے، خدا تم کو تمھارے سفر میں کامیاب کرے، تم کو صحت کے ساتھ لے جائے، صحت کے ساتھ لائے، تمھیں اپنے بچوں کو، اپنے گھر والوں کو تندرست اور صحت مند دیکھنے کا موقع ملے، تمھاری تجارت کامیاب ہو۔

سب سے قابل حفاظت سرمایہ

لیکن نبی مرسل، اللہ کے محبوب نبی، اور - دیکھو - اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کی نبوت کا مزاج بنایا تھا، ایک ہوتا ہے کارِ منصبی اور ایک ہوتا ہے مزاج، مزاج ایک زبان پیدا کرتا ہے، طرزِ ادا پیدا کرتا ہے، حکمت پیدا کرتا ہے، موقع شناسی پیدا کرتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس پر اصل چیز حاوی رہتی ہے، جس پر سعادت وشقاوت کا فیصلہ ہے، ہلاکت اور نجات کا فیصلہ ہے، اور کامیابی وناکامی کا فیصلہ ہے، اس لیے مجھے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملتے کہ میں - اپنے پورے نقص، اور اپنے عجز، اپنی گناہ گاری اور اپنی ناکارگی کے پورے اعتراف کے ساتھ - آپ سب مندوبین سے کہوں: أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَ أَمَانَتَكُمْ وَ خَوَاتِيْمَ أَعْمَالِكُمْ، آپ جب یہاں سے جائیں تو میں دعا کرتا ہوں، "میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں آپ کا دین"، معلوم ہوا کہ سب سے بڑا سرمایہ جو قابل حفاظت ہے، اور قابل رعایت ہے، اور قابل اہتمام ہے، اس کے لیے جدوجہد اور ہر طرح کا خطرہ مول لینا صرف مناسب ہی نہیں، بلکہ اکثر اوقات ضروری ہے، وہ دین ہے، اور اس کنونشن کا پورا خلاصہ اس کے اندر آ جاتا ہے، کیا کہا گیا؟ کیا خطبۂ افتتاحیہ میں کہا گیا؟ کیا خطبۂ صدارت میں کہا گیا؟ کیا حضرات علماء نے تقریروں میں کہا؟ یہی تو کہا نا کہ اپنے دین کی فکر کیجیے، دِيْنَكُمْ کہا، جمع کا صیغہ، اپنے دین کی فکر کیجیے، اپنے بچوں کی فکر کیجیے، آئندہ نسل کی فکر کیجیے، اس لیے کہ اتنا کافی نہیں ہے کہ آپ اسلام پر قائم رہیں، اسلام پر دنیا سے رخصت ہوں، صرف اتنا کافی نہیں، کم سے کم مسلمان کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے جمع کے صیغہ کے ساتھ کہتا ہوں: أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ، آپ اپنے دین کی فکر کریں، اور اللہ کے میں سپرد کرتا ہوں کہ آپ کا دین محفوظ رہے۔

اجتماعی طور پر دین کے محفوظ ہونے کی ضرورت

اور دین جب محفوظ رہے گا آپ کا بھی، یہاں تک میں تجربہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ آپ کا دین بھی جب محفوظ رہے گا، شاید یہ انکشاف ہو بہت سے لوگوں کے لیے، لیکن

نفسیات کے ایک ادنی طالب علم اور تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں، تاریخ انسانی کے، اور دعوتوں کی تاریخ، اصلاحات، تحریکات کی تاریخ، اور انسانی مد و جزر کی تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اپنا دین بھی اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہے اور محفوظ نہیں ہے، اس کی ضمانت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ آپ کے گھر کا دین محفوظ نہ ہو، آپ کے بچوں کا دین محفوظ نہ ہو، آپ کے جو متعلقین ہیں، آپ کی خواتین، ان کا بھی دین محفوظ نہ ہو، ہم نے بارہا دیکھا ہے اور آپ نے دیکھا ہے کہ ایک صالح سے صالح آدمی، بڑا خداترس انسان، عابد وزاہد، اور یہاں تک کہہ دوں کہ تہجد گزار بھی، وہ اپنے دین کو قائم نہیں رکھ سکا، اس لیے کہ اس کے گھر میں دینی ماحول نہیں تھا، وہ رات کو جاگنا چاہتا، اٹھنا چاہتا ہے، لیکن گھر کا ماحول ایسا ہے کہ اس کو سلائے، اور بلکہ اٹھ جائے تو اس کی طرف وہ نگاہیں اٹھیں کہ جو اس کو یہ محسوس کرائے کہ ماحول ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس کو پسند نہیں کر رہا ہے، پھر محلّہ کا دین، پھر قصبہ کا دین، پھر شہر کا دین، اور آخر میں کہتا ہوں ملک کا دین بھی اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا اور اس کا اطمینان نہیں کیا جا سکتا، اس کی ضمانت نہیں لی جا سکتی جب تک کہ اجتماعی طور پر دین محفوظ نہ ہو۔

دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا محرک

اور یہی اس کنونشن کا، بلکہ دینی تعلیمی کونسل کے ایک خادم اور اس کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہی محرک ہے اس کے قیام کا کہ ہندوستان میں مجموعی طور پر اور اجتماعی طور پر دین محفوظ ہو، جب تک اجتماعی طور پر دین محفوظ نہیں ہوگا، انفرادی طور پر دین کے محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، اور اطمینان نہیں کیا جا سکتا، دین جب محفوظ ہوگا جب فضا میں دین ہوگا، ماحول میں دین ہوگا، گھر میں دین کی باتیں ہوں گی۔

گھر کے اندر دینی ماحول پیدا کیجیے!

اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ بات رہ گئی بہت سے کہنے والوں سے، اور خود

مجھ سے بھی کہ گھر کے اندر دینی باتوں کا ماحول پیدا کیجیے، انبیاء (علیہم الصلاۃ والسلام) کے واقعات سنائے جائیں، اپنی خواتین کو آپ تلقین کیجیے کہ وہ اپنے بچوں کے کان میں شروع سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بت شکنی کا واقعہ، میں پوری صراحت سے۔بغیر کسی معذرت کے۔کہتا ہوں کہ ان کی بت شکنی کا واقعہ آپ بچوں کے کان میں شروع سے ڈال دیں، تاکہ وہ سمجھیں کہ خدا کے اس خلیل نے یہ کیا کام کیا؟ اور خدا کا خلیل جو کام کرتا ہے اس کام پر کوئی تنقید یا اعتراض نہیں کیا جاسکتا، اور اس میں کوئی نقص نہیں، اور اس کے لیے کسی شرمندگی کی ضرورت نہیں، یہ بات ان کے دل میں بیٹھ جائے، یہ زمانہ گزرا ہے ابھی، بدوِ شعور کا زمانہ بھی نہیں کہہ سکتا، اس سے کچھ پہلے کا یہ زمانہ گزرا تھا کہ ہمارے گھروں میں ایسے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایسی کتابیں پڑھی جاتی تھیں جن سے توحید کا عقیدہ راسخ ہو، اور بلکہ اتنا ہی نہیں، معذرت کے ساتھ آپ کو یہ واقعہ سناؤں گا کہ وہ اشعار پڑھائے جاتے تھے کہ جن سے شہادت فی سبیل اللہ، جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہو، میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو ہندوستان کے مشہور فاضل اور مؤرخ اور عالم تھے، اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، ان کے ایک بہت بڑے مخلص دوست نے مجھے خود سنایا کہ آپ کے والد صاحب یہ کہتے تھے کہ میری نانی صاحبہ جب مجھے سلاتی تھیں تو یہ شعر پڑھ کر سلاتی تھیں اور میں سوجاتا تھا:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ کسی معمولی شاعر کا شعر نہیں، یہ مومن خاں کا شعر ہے، اور وہ حضرت سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کے مریدین میں ہیں، اور یہ جذبہ ان میں وہیں سے آیا، تو آپ یہ خیال کیجیے کہ ماں سلائے بچے کو، اور نانی بھی ماں کی طرح، بعض مرتبہ ماں سے زیادہ شفیق ہوتی ہے، تو زندگی کی دعائیں دی جاتی ہیں، کہ الٰہی مجھے نوح کی عمر نصیب ہے، الٰہی مجھے ہمیشہ اچھا رکھ، مجھے عمر طویل عطا فرما، یہی نثر میں کہا جاتا ہے، یہی گیتوں میں کہا جاتا ہے، لیکن آپ سوچیے کیا ماحول تھا کہ اس میں شفیق نانی اپنے نواسے کو سلاتے وقت یہ شعر پڑھ رہی ہیں:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

بتایئے اس گھر کا، اس خاندان کا رنگ کیا ہوگا؟ آج اُس رنگ کو خاندانوں میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے، یہ سب مدارس ومکاتب، یہ بالکل مقصود ہیں، اور ہمارے بنیادی مقاصد میں ہیں، اور دینی تعلیمی کونسل کا قیام انھی کے قیام اور انھی کے دوام اور انھیں کی ترقی کے لیے ہوا ہے، لیکن میں اسی کے ساتھ اتنا اضافہ کروں گا کہ گھروں میں وہ ماحول پیدا کیجیے کہ بت پرستی سے نفرت پیدا ہو، خدا کے سامنے کسی کا سائل بننے سے نفرت پیدا ہو، خدا کے سوا کسی سے ڈرنے سے بھی آدمی ڈرے، اور شرم کرے، اور خدا کے سوا کسی کا نام لینے سے بھی آدمی کو جھجک ہو، ہمارے گھروں میں اگر یہ ماحول نہ ہوا تو مدارس ومکاتب کی یہ ساری کوششیں- ان کی پوری قدر دانی اور قدر دانی ہی نہیں بلکہ ان کی ذمہ داری بھی قبول کرنے کے ساتھ میں عرض کرتا ہوں کہ- ناکافی ہوں گی۔

امانت کا مفہوم

تو ایک بات تو یہ کہ میں آپ کے لیے (أُوصِيْ نَفْسِيْ أَوّلًا)، اپنے لیے اور آپ سب کے لیے دعا کرتا ہوں کہ أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَ أَمَانَتَكُمْ، اور یہ 'امانت' کا لفظ بھی یہاں پر ایک معجزانہ لفظ ہے، اس کی تشریح نہیں ہوسکتی، اس میں سب کچھ آجاتا ہے، یعنی آپ پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اپنی اولاد کے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں، اپنی تجارت کے بارے میں، حلال وحرام کے بارے میں، اور شہریوں کے بارے میں، اور ہم سایوں کے بارے میں، ہر چیز اس میں آجاتی ہے، سب سلامت رہے، تو عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ 'امانت' کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں بہت مشکل ہے، میں اعتراف کرتا ہوں باوجود اس کے کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، اور شعر وادب کا رسیا ہوں، اور ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا ہوں کہ جہاں پر شعراء کے تذکرے لکھے گئے ہیں، اور پھر میں نے عربی زبان عربوں سے پڑھی ہے، یہ میں مجبوری سے کہہ رہا ہوں کہ

میری پوری عربی زبان اول سے آخر تک سب عربوں سے پڑھی ہوئی ہے، کسی ہندوستانی کے یہاں چند معمولی سبق پڑھ لیے ہوں تو پڑھ لیے ہوں، اور وہ عرب بھی معمولی عرب نہیں، بلکہ وہ اس وقت کی دنیائے عرب کے ممتاز ترین معلمین تھے، میں اس کے بعد اعتراف کرتا ہوں کہ امانت کا ترجمہ میں نہیں کر سکتا، امانت سب پر حاوی ہے، احساس ذمہ داری، فرض شناسی، خدا ترسی، اور حقوق کی ادائیگی، سب چیزیں اس میں آتی ہیں، یہ نبی ہی کہہ سکتا تھا، نبی کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اس موقع پر کہ أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ، پھر اس کے بعد خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ کہا، اُس سفر کا ایک منتہا ہے، اور وہ ضرور پیش آئے گا، اور اِس سفر حیات کا بھی ایک منتہا ہے، اور اِس سفر حیات کا منتہا اُس سفر کے منتہا سے کہیں زیادہ اہم ہے، تو ایک تو میں یہ عرض کرتا ہوں۔

اس ملک میں دین کے باقی رہنے کی سب سے بڑی وجہ

اور میں ایک بات اور اپنے فرائض میں سمجھتا ہوں کہ بعض تقریروں میں اور بعض چیزیں جو پڑھی گئیں، ان میں اس پر زور دیا گیا، توجہ دلائی گئی کہ ہمارے مدارس میں عصری نصاب ہو، بلکہ یہاں تک کہ اشارے کیے گئے کہ مدارس میں ٹیکنالوجی وغیرہ کی بھی تعلیم ہونی چاہیے، میں آپ کے سامنے بغیر کسی تواضع کے کہتا ہوں کہ تاریخ اسلام کے ایک طالب علم کے اور دعوت اسلامی کے ایک طالب علم ہی نہیں، بلکہ مصنف کی حیثیت سے، اور پھر خدا مجھے معاف کرے اور آپ بھی معاف کریں کہ اس موضوع پر ایک بہت اہم اور ضخیم کتاب لکھنے والے کی حیثیت سے، یعنی 'تاریخ دعوت وعزیمت' کے مصنف کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہندوستان میں اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں اسلام کے باقی رہنے کی ایک بہت بڑی وجہ سلاطین اور دوسرے وسائل ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہمیشہ ایک جماعت ایسی رہی، علماء کی جماعت، داعیوں کی جماعت کہ انھوں نے دوسروں کو دین پہنچانے اور دین سکھانے کے سوا اپنی زندگی کا کوئی مصرف اور مقصد سمجھا ہی نہیں، اس کو چاہے کمزوری پر محمول کیا جائے، چاہے انھوں نے جو کچھ بھی اس کی قیمت ادا کی ہو، لیکن یہاں

ہندوستان میں جو دین باقی رہ گیا، اسی وجہ سے کہ یہاں ایسے لوگ رہے کہ جو کہتے تھے کہ ہم سے تو صرف خدا کے یہاں یہ سوال ہوگا کہ تم نے لوگوں کو دین پہنچایا تھا یا نہیں پہنچایا؟

عرب ممالک میں بے دینی کی ایک بڑی وجہ

اور میں آپ سے صاف کہتا ہوں، شاید اس مجمع میں (خدا مجھے معاف کرے) اس مجمع میں کوئی ایسا نہیں ہوگا - اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے، میں مجبوراً کہہ رہا ہوں کہ - جس نے ممالک عربیہ کی اتنی سیر کی ہو، ممالک عربیہ میں اتنا وقت گزارا ہو جتنا میں نے گزارا ہے، مختلف حیثیتوں سے، میں آپ کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ آج مصر و شام میں اور عراق میں جو بے دینی پھیل رہی ہے، اور تعلیم یافتہ طبقہ میں جو دینی انحراف ہے، اور دین سے غفلت ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے - میں نے وہاں رہ کر معلوم کیا - کہ ایسے لوگوں کا قحط ہے یا کمی ہے جو اپنے کو بالکل سو فیصدی دینی دعوت کے حوالے کر دیں، وہ وہاں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں، اور دوسرے کام سیکھتے ہیں، یورپ جاتے ہیں، وہاں سے ڈگریاں لاتے ہیں، اور Specialize کرتے ہیں، اور وہ سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں، ان کو فرصت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی خالص دینی تقریر کریں، آپ دیکھیں کہ مساجد کے ائمہ خطبہ کے اندر کچھ کہہ لیتے ہیں، یا کبھی کوئی مسئلہ ہو تو کہہ لیں، یا جب اخوان المسلمون کی تحریک تھی، میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے، اس وقت دین کے داعی تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا، لیکن اس عنصر کی برابر ممالک عربیہ نہیں، ممالک اسلامیہ میں کمی ہوتی چلی جا رہی ہے، ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ایک ایسی جماعت رہی ہے ہمارے مدارس کے فضلاء کی، جو کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے، ہم تو دین کی دعوت دیتے ہیں، ہم دین کے لیے تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

ایک واقعہ

میں ایک واقعہ لطیفہ کے طور پر آپ کو سناتا ہوں بہت عبرت ناک واقعہ ہے، مولانا نجم

الغنی رامپوری صاحب نے اس کو تاریخ اودھ میں لکھا ہے، اور میرے والد صاحب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے 'نزہۃ الخواطر' میں اس سے نقل کیا ہے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب رامپور میں ایک عالم تھے، بڑے جامع علوم عالم تھے، یعنی وہ جس طریقے سے قرآن و حدیث کے عالم تھے، کتاب وسنت کے، فقہ کے عالم تھے، ویسے ہی ریاضیات میں بھی ان کو بہت دخل تھا، میتھ میٹکس (Mathematics) میں اور اسی طریقہ سے ہیئت میں، اقلیدس میں، ان سب میں بڑا دخل تھا، تو اسی زمانہ میں غالباً ۱۸۵۷ء کا بالکل ابتدائی زمانہ ہے، یا ابھی پورے ملک میں انگریزی حکومت قائم نہیں ہوئی اور غالباً ہو چکی ہے، کہ بریلی میں پہلا انگلش کالج قائم ہوا، اس کے پرنسپل ہاکنس کو معلوم ہوا کہ رام پور میں ایک مولوی صاحب ہیں، جو دینی علوم اور ریاضی علوم پر بھی پورا اقتدار رکھتے ہیں، پورا عبور رکھتے ہیں، ان کو بھی بلانا چاہیے، یہ ہمارے کالج کے لیے بھی بڑے فخر کی بات ہوگی، تو اس نے پیغام بھیجا، تو انھوں نے بہت صفائی اور سادگی سے کہا کہ میں تو آجاتا لیکن میں کیا کروں، میری یہاں تنخواہ دس روپے ہے جو بند ہو جائے گی، اور اس نے ڈھائی سو روپے کے پیش کش کی تھی، ڈھائی سو روپے آج کے نہیں ہیں، ۱۸۵۷ء کے حساب سے لگائیے، انھوں نے کہا کہ آپ حساب سے بھی واقف ہیں، میتھ میٹکس (Mathematics) سے بھی واقف ہیں، آپ دوسو روپیہ اور پندرہ کا فرق نہیں سمجھتے؟ تو انھوں نے کہا: یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ایک دقت اور ہے، وہ یہ کہ میرے گھر کے دروازہ پر ایک بیری کا درخت ہے، اور میں صبح اسی کا ناشتہ کرتا ہوں، اور تازی تازی بیری مجھے چاہیے، میری صحت کے لیے ضروری ہے، میں اگر وہاں بریلی آگیا تو وہاں وہ تازی بیری نہیں ملے گی، اس نے کہا: میں ڈاک کے ذریعہ سے انتظام کر دوں گا کہ بیری پہنچ جائے اور آپ صبح اس کا ناشتہ کریں، پھر انھوں نے کہا: خیر یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ایک دقت اور ہے، میرے جو طالب علم ہیں ان کی تعلیم ناقص رہ جائے گی، کوئی کہیں پہنچا ہے کوئی کہیں پہنچا ہے، کسی کی کتاب آدھی ہوئی، کسی کی چوتھائی ہوئی ہے، تو یہ شکایت کریں گے اور ان کی تعلیم بھی ناقص رہ جائے گی، وہ بہت تجربہ کار آدمی، لائق پرنسپل تھا، اس نے کہا: سب کی اسکالرشپ منظور ہے، سب اسکالرشپ پر جائیں گے، آپ سب کو لے آئیے، اب کیا

جواب دیں؟ اخیر میں انھوں نے کہا کہ سب کا جواب مل گیا، ایک چیز کا جواب اور چاہیے کہ اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ تم رامپور سے بریلی اس لیے گئے تھے کہ وہاں دس روپے ملتے تھے اور وہاں ڈھائی سو روپے ملتے تھے، تو میں کیا جواب دوں گا؟

دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کی ضرورت

حضرات! میں شہادت دیتا ہوں کہ ہندوستان کو بعض چیزوں میں امتیاز حاصل ہے، یہ نتیجہ ہے ان لوگوں کی کوششوں کا جو ۲۴ گھنٹہ اس کے لیے وقف تھے، اور کسی چیز سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا، وہ بڑے سے بڑے کسی انتظامی کام میں بھی شریک ہو سکتے تھے، اس کی ذمہ داری قبول کر سکتے تھے، خدا نے ان کو ذہانت دی تھی، قوت عمل بھی دی تھی، اور لوگ جانتے تھے، اور یہ جال تو باہر ڈالے گئے، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہمارا کام صرف دعوت دینا، تبلیغ کرنا اور پڑھانا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۵۷ء کا ہنگامہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے کاٹ نہیں سکا، آپ اگر ۵۷ء کی تاریخ پڑھیں، وہ تاریخ نہیں جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے، اور انگریزوں نے لکھی ہے، بلکہ آپ وہ تاریخ پڑھیں جو بیاضوں میں ملتی ہے، ملفوظات میں ملتی ہے، لوگوں کے حالات میں ملتی ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دین جو اس وقت تک قائم رہ گیا، اور آج یہ مدارس ہیں اور آج ہم یہاں بیٹھ کر اس آزادی کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں، یہ نتیجہ ہے ان مخلص علماء کا جنھوں نے فاقے کیے ہیں، اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہے، اور اپنے بچوں کو فاقہ کرایا ہے، لیکن تبلیغ کا کام کیا ہے، دعوت کا کام کیا ہے، اور تعلیم کا کام کیا ہے، اور میں پورے وثوق کے ساتھ۔ جس خلوص سے بھی یہ مشورے دیے جاتے ہیں۔ اس خلوص کا اعتراف کرتے اور قدر کرتے ہوئے یہ کہوں گا، اور اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ دین کے لیے ضروری ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور جو گویا کچھ اور جانتے نہ ہوں، مجھے معلوم ہے کہ یہاں کیسے کیسے علماء گزرے ہیں جو کیا کیا جانتے تھے، لیکن انھوں نے صرف دعوت کے کام سے تعلق رکھا یا تصنیف و تالیف کے کام سے تعلق رکھا۔

میں ایک مدرسہ کے خادم بلکہ کسی حد تک ذمہ دار کی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں کہ کم

سے کم میری زندگی میں اس مدرسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کوئی ایسا نصاب نہیں آ سکتا، اور کوئی ایسا نظام جاری نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگوں کو صرف کہیں ملازمت دلا سکے،، بلکہ میں صاف کہتا ہوں اپنے ان طلبہ سے کہتا ہوں کہ میں تمھارے امارات میں اور خلیج میں جانے اور سعودیہ عرب میں کمانے کے لیے جانے کا مخالف ہوں، ہم تم کو اس لیے نہیں پڑھا رہے ہیں کہ تم جس طرح انگریزی پڑھنے کے بعد جنوبی افریقہ اور انگلینڈ اور برطانیہ، اور ان جیسے دوسرے ممالک جہاں انگریزی بولی جاتی ہے، چلے جایا کرتے تھے، وہاں جا کر کے بڑی ملازمتیں حاصل کرتے تھے، اور تنخواہیں پاتے تھے، اب تم اس انگریزی کے بجائے عربی پڑھ رہے ہو تا کہ تم امارات میں جا کر، اور سعودی عرب میں جا کر ملازمت کرو، یہاں ان کو دو سو ملتے، وہاں ان کو دو ہزار ملیں گے، الحمدللہ ہماری یہاں کے بعض اساتذہ ایسے ہیں (میں اپنی ذات کے بارے میں نہیں کہتا) کہ جو اگر خط لکھ دیں تو دو ہزار اور پانچ ہزار کی تنخواہ فوراً مل سکتی ہے، ایسے اساتذہ ہیں جو وہاں معروف ہی نہیں، محترم ہیں، جن کی تحریریں بڑے شوق اور بڑی قدر سے پڑھی جاتی ہیں، انھوں نے ترجیح دی ہے یہاں رہنے کو تا کہ یہاں دین کی خدمت کریں، علم کی خدمت کریں، اور ان کے شاگرد معلوم نہیں کیا کما رہے ہیں۔

ائمۂ مساجد کو محکمۂ اوقاف سے تنخواہ دینے کی مخالفت کیوں؟

تو میں صاف پھر ان سے کہوں گا کہ اتنے طلبہ موجود ہیں، کہ ہم تم کو اس لیے نہیں پڑھا رہے ہی کہ تم جا کر عرب ممالک میں عربی زبان کو ذریعہ بناؤ اپنی آمدنی کا، اپنی عزت اور اقبال مندی کا، ہم تمھیں اس لیے پڑھا رہے ہیں کہ تم دین کو اس ملک میں محفوظ رکھنے کے لیے تم اپنی جان لڑا دو، تم اپنی پوری توانائی اس پر صرف کر دو، اور یہ دین جو اس وقت تک قائم رہا، وہ اسی وجہ سے قائم رہا کہ برابر ایسے لوگ نکلتے رہے کہ جو ایسی چھوٹی تنخواہوں پر جن کا تصور بھی اب مشکل ہے، کام کرتے رہے، انھوں مسجدوں میں امامت کی، اسی لیے ہم مخالف ہیں کہ مسجدوں کے اماموں کی تنخواہ محکمۂ اوقاف سے مقرر ہو، سن لیجیے، اور میرا یہ اعلان، میں یہ جو کہہ رہا ہوں، اسے پہنچا دیجیے دور دور تک کہ میں بہت سخت خطرہ سمجھ رہا ہوں، اسلام کے

خلاف ایک سازش سمجھ رہا ہوں، اور اسلام دشمنی کے مرادف سمجھ رہا ہوں کہ ائمہ کو ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار کی تنخواہیں ملیں، پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان سے الیکشن میں کام لیا جائے گا، ان سے سیاسی مقاصد حاصل کیے جائیں گے، ان کے دورے کرائے جائیں گے، اور مسجدں میں وہ بجائے اللہ اور اس کے رسول سے ڈرانے کے، حکومت کی ناراضگی کے امکانات سے، اس کے خطرات سے ڈرائیں گے۔

سب سے ضروری کام

میں اپنے رفقاء سے معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں اس موضوع خاص سے جو اجتماع کا تھا، اس سے ذرا ہٹ کر میں نے یہ بات کہہ دی، اس لیے کہ بات کہی جارہی ہے، بہت جگہ، میں نے سنی ہے، اور میں نے اُس کی تردید بھی کی ہے، ہمارے یہ عربی مدارس خاص دینی تعلیم کے لیے رہیں گے، اور یہ دین کے فضلاء پیدا کریں گے، داعی پیدا کریں گے، اور جگہ جگہ یہ مکتب قائم کریں گے، میں ان سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ سب سے ضروری کام آپ کا یہ ہے کہ آپ جہاں جائیں وہاں محلے میں وہاں کے لوگوں کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ مسجدوں مکتب میں قائم کریں، اپنے گھر پر قائم کریں، اور اپنے گھر میں دینی ماحول پیدا کریں، اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں، اور اپنے بچوں کو اس قابل بنائیں کہ قرآن مجید پڑھ سکیں، یہ آپ کا پہلا کام ہوگا، اور پھر کہتا ہوں ـ سب سن رہے ہیں ـ کہ سب سے ضروری کام یہ ہے کہ آپ یہاں سے جا کر اپنے موضع میں، اپنے گاؤں میں، اپنے محلّہ میں اسلامی مکتب قائم کرائیں، اور اردو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرانے کی کوشش کریں، اور گھروں میں دینی ماحول پیدا کریں کہ بیویاں اپنے بچوں سے دین کی باتیں کریں، وہ باتیں کریں کہ جن سے توحید کی عظمت پیدا ہو، اور کفر وشرک کی نفرت پیدا ہو، اور خدا ترسی، خدا کا خوف پیدا ہو، اور معاصی سے نفرت پیدا ہو، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔ (۱)

(۱) دار العلوم، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں ۱-۲/نومبر ۱۹۹۳ء کو منعقد دینی تعلیمی کنونشن کی اختتامی تقریر، یہ تقریر قلمبند کرنے کے بعد اب شائع کی جارہی ہے۔

حاملین علم اور اہل حق کے ساتھ آزمائشیں

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُولٰٓـئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓـئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ [سورة البقرة: ۱۵۵-۱۵۷]

میرے عزیز ساتھیو اور دارالعلوم کے فرزندو اور شریف خاندان کے افراد! میں اس آیت کو اپنی تقریر کا عنوان بنانا چاہتا تھا، جو ابھی قاری صاحب نے پڑھی، اور یہ بالکل حسب حال ہے، بلکہ مسلمانوں کو، امت اسلامیہ کو بالعموم اور حاملین علم کو اور ذمہ داروں کو اور جو دینی منصب رکھتے ہیں اور جن پر امت کی ذمہ داری ہے، نہ صرف دعوت و اصلاح کی، بلکہ امت کے لیے نمونہ بننے کی، ان کے لیے ایک ہدایت بھی ہے، اور پیشین گوئی بھی ہے، اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے عالم الغیب ہونے اور اس کے رحیم ورحمٰن ہونے، اس کے عزیزٌ ذو انتقام ہونے، ان تمام صفات کی یہ آیت گویا جلوہ گر ہے، اور اس کا ایک دستور العمل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾

اے مسلمانو! پھر اس آیت کا سیاق بتاتا ہے کہ ان میں بھی (یعنی مسلمانوں میں بھی) جو دعوت کا امتیاز رکھتے ہیں، عقیدے کا امتیاز رکھتے ہیں، ایمانی طاقت کا امتیاز رکھتے ہیں، مسلمانوں کی دعوت واصلاح کی ذمہ داری کا امتیاز رکھتے ہیں، وہ خاص طور پر مخاطب ہیں۔

آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ وہ طبقہ جو اونچا طبقہ ہو، یا اہل علم کا طبقہ ہو، اور جو داعیوں کا طبقہ ہے، وہ خاص طور پر مخاطب ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ''اور ہم تمھاری آزمائش کریں گے ضرور تھوڑے سے خوف سے،'' یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت ہے کہ وہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کہہ رہا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کہہ رہا ہے، اللہ کے نزدیک جو بھی بڑے سے بڑے مصائب پیش آتے ہیں، بڑے سے بڑے خطرات درپیش ہوتے ہیں، یہ سب اس کے نزدیک ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ہے، اس سے تسکین دینی بھی مقصود ہے اور حقیقت بیان کرنی بھی مقصود ہے، کہ بہت بڑی گھناؤنی، مہیب، ہائل اور لرزہ براندام کردینے والی چیز تو بہت بڑی چیز ہے، اس کا تحمل بھی نہیں، یہ جو مسائل پیش آتے ہیں، جو آزمائش پیش آتی ہے، یہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے تسکین بھی دی ہے، اور تیار بھی کردیا اس کے لیے کہ وہ بہت اہمیت نہ دے کہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾، یہ سب لفظ بتاتے ہیں کہ ﴿نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ اس کو لفظ ''نقص'' سے تعبیر کیا، اور اس کو ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ سے تعبیر کیا، اور ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ ''اور ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیجیے کہ جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾، کہ ہم کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، ہم اللہ کے ہیں، اس کو اختیار ہے جو چیز ہمارے لیے پسند کرے، جس چیز کو ہماری ترقی درجات کا ذریعہ سمجھے، جس چیز کو وہ مصلحت سمجھے، وہ پیش آسکتی ہے۔

مدارس عربیہ کی روایت

عزیزو! جن کے ہم نام لیوا ہیں، اور جن کے وارث ہیں، جن علمائے ربانیین کے ہم وارث ہیں، اور ہم جہاں بیٹھے ہیں، یہ ہمارا مرکز ہے، دینی مدارس عربیہ ان کی روایت شروع سے یہ رہی ہے کہ ان کے چوٹی کے علماء نے اور اپنے زمانے کے گویا مجددین ومجتہدین، معلمین اور داعیوں نے ایسے حالات کا مقابلہ کیا، جو ان کو پیش آئے ہیں، وہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا، سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کی تاریخ آپ پڑھیں تو بعض دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا یحییٰ علی (رحمۃ اللہ علیہ) اوران کے رفقاء جیل خانہ میں تھے، ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، لیکن ان کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ انگریز مرد اور لیڈیز جو آئی تھیں، تماشا دیکھنے کے لیے اور Enjoy کرنے کے لیے، گویا لطف اٹھانے کے لیے کہ ہمارے دشمنوں کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی، تو ہمارے لیے تفریح کا موقع ہوگا اور خوشی کا، تو دیکھا کہ مولانا جعفر تھانیسری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور اُن کے جو ساتھی تھے، جب ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ خوش خبری کا مژدہ سنایا گیا ہے، تاریخ میں لکھا ہوا ہے، تاریخ کی بات بتا رہی ہے، مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی'' پڑھیں، ''سوانح احمدی'' پڑھیں، اور ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' پڑھیں تو یہ واقعہ ملے گا، ان میں سے بعض دریائے حیرت میں ڈوب گئے، بعض قریب آگئے، بعض عورتوں نے کہا: تم سمجھ رہے ہو؟ اس وقت ہوش میں ہو؟ حواس تمہارے ٹھیک ہیں؟ کیا تم نے سنا کیا کہا گیا؟ کہا: ہم نے سنا ہمیں موت کی سزا دی گئی، کہا: تو تم اتنے خوش کیوں ہو؟ کہا: شہادت کی خوشی میں، تم نہیں جانتے کہ شہادت کیا چیز ہے۔!!

تو ہندوستان کی کم از کم عائلی اور قانونی تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ سزائے موت دی جاتی ہے، تو بڑی کوشش کی جاتی ہے کہ دریائے شور کی سزا سے بدل جائے کہ کم سے کم اپنی زندگی باقی رہتی ہے اور وہ کالا پانی بھیج دیا جاتا ہے، بہت سے لوگ وہاں برسوں رہ کر آگئے ہیں، اور جعفر علی تھانیسریؒ ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو انڈومان اور کالے پانی گئے تھے، اس کے بعد پھر ان کو معافی دے دی گئی، تو بڑی کوشش کی جاتی ہے اور بڑے اعلیٰ درجے کے وکیل لائے جاتے ہیں کہ قانون داں اس میں کامیابی حاصل کریں کہ سزائے موت کو عبور دریائے شور سے بدل دیا جائے، لیکن پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہمارے علم میں کہ بغیر کسی قانونی چارہ جوئی اور کوشش کے اس خیال سے سزا بدل دی گئی کہ یہ بہت خوش تھے، ہم ان کو خوش کرنا نہیں چاہتے، اس لیے دریائے شور کی سزا دی جاتی ہے، اور دی گئی، اور مولانا یحییٰ کا وہیں انتقال ہوا، وہیں مدفون ہیں۔ خیر آباد کے ایک بڑے عالم جو ادیب اور شاعر تھے،

مولانا فیض احمد خیرآبادی، ان کا ایک دیوان بھی ہے، وہ ہمارے کتب خانے میں ہوگا، وہیں ان کا انتقال ہوا، ان بزرگوں کا جہاں انتقال ہوا اس کی ''کالا پانی'' کہا کرتے تھے۔

مدارس اسلامیہ اور جنگ آزادی

میرے عزیزو! یہ ہمارے اسلاف کی روایت چلی آرہی ہے، اور اس سے مختلف اور کم و بیش بہت سے طریقے ہوتے تھے، جو اس وقت کے حق گو علماء کو اور داعیوں کو بڑی سے بڑی سزا دی جاتی تھی، یہاں جو کچھ پیش آیا، یہ بات، یہ پہلو، حکومت کا یہ عمل کتنا بے جا اور ہندوستان کو کتنا نقصان پہنچانے والا ہے، صرف یہی مدارس ہیں جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑا حصہ لیا، حضرت شیخ الہند (رحمۃ اللہ علیہ) کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، حضرت مدنیؒ کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، مولانا مدنیؒ، خود مولانا آزادؒ اس ندوہ میں جب یہ ندوہ وہاں گولہ گنج میں تھا، وہاں ندوہ میں چھ مہینے رہے، اور مولانا شبلیؒ کی سرپرستی اور ان کی رہنمائی میں ''الندوہ'' کے نائب ایڈیٹر تھے، آپ کا اخیر تک تعلق رہا اور وہ مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے اور ان کا بڑا تعلق تھا یہاں سے۔

لیکن یہ جو پیش آیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی، اس میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ چیزیں پیش آسکتی ہیں اور یہ کوئی پھولوں کا فرش نہیں ہے بلکہ یہ وہ راستہ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی ہیں اور نشیب و فراز بھی ہیں، آپ کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس سے دل شکستہ ہونا چاہیے، اس میں تو سراسر نقصان پہنچا، صفائی کے ساتھ کہتا ہوں حکومت وقت کو اور اس پارٹی کو جو حکومت کر رہی ہے، اس لیے کہ ہندوستان سے باہر کے ممالک میں اس کی بڑی قدر ہے، عالموں کو، اور اہل علم کو اور فضلاء کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور دوسرے کم سے کم اسلامی ممالک میں ہندوستان کا بڑا تعارف ہے، مؤثر اور وسیع تعارف ہے، اور وہ ان مدارس عربیہ کی وجہ سے ہے، آپ کہیں چلے جائیے، کسی عرب خطے میں یہاں سے لے کر مراکش تک آپ چلے جائیے، وہاں آپ انہی مدارس کے نام سنیں گے، وہ جانتے بھی نہیں تھے کسی کو، یہاں کے علماء جانتے ہیں کہ قاموس کی شرح کس نے لکھا،

اور اصطلاحات علمیہ پر سب سے بہتر کتابیں پوری اسلامی تاریخ میں دو مانی جاتی ہیں، ایک احمد نگر کے تھے، اور ایک تھانہ بھون کے تھے، اصطلاحات علمیہ اس طرح کی کتاب ہے، اور اصطلاحات کا فن نازک، مشکل ترین فن ہے، اصطلاحی تشریح میں ذرا بھی غلطی ہو جائے تو کیا سے کیا ہو جاتا ہے، جس کی رہنمائی میں جس طرح جہاز کا نقشہ ہوتا ہے، جس کی رہنمائی سے جہاز چلتا ہے، اس میں اگر کوئی فرق ہو تو جہاز کہیں پہنچ جاتا ہے، یہی اصطلاح کا حال ہوتا ہے، پورے اسلامی کتب خانے اور پوری اسلامی ثقافت، علوم اسلامیہ کی تاریخ میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ مسلم کتاب جو ہے ہندوستان کے علماء کی ہے، تمام عرب ممالک میں ہندوستان کی وقعت یہاں کی آثار قدیمہ کی وجہ سے ہے اور نہ بڑی عمارتوں کی وجہ سے ہے، اور نہ یونیورسٹیوں اور نہ جامعات کی وجہ سے ہے، وہاں اگر قدر ہے تو یہی دیوبند، ندوۃ العلماء، مظاہر علوم اور یہاں کے فضلاء کی وجہ سے ہے، ان کی کتابیں بڑی عزت کی نگاہ کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں، اور پڑھی جاتی ہیں، پڑھائی جاتی ہیں، اور سب جانتے ہیں۔

سعادت کی ہوا

یہ واقعہ جو پیش آیا یہ ایسا بے محل، بے ضرورت اور غیر عاقلانہ واقعہ تھا جس کو پریس کانفرنس میں کہا جائے گا، اس کو تو اخباروں میں چھاپا جائے گا، اس کے لیے اظہار خیال کا کوئی بڑا ذریعہ استعمال کیا جائے گا، لیکن آپ سے یہ کہنا ہے کہ اشتعال انگیزی نہ ہو اور یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بھی اس سعادت کی ہوا لگ گئی، آپ کو بھی وہ جھونکا پہنچ گیا اس ابتلاء و آزمائش کا جو علمائے حقانی کے حصہ میں آیا تھا، جو بڑے بڑے اللہ کے مقبول بندوں کے حصے میں آیا تھا، جن کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں تھا، اس ہوا کا باد خزاں نہیں کہنا، باد بہاری کا ایک جھونکا آپ کو بھی لگ گیا، ان میں سے بعض لوگوں کو زیادہ حصہ ملا، اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں جن کو چوٹیں آئیں یا جن کو پریشانی اٹھانی پڑی، وہ انشاء اللہ اس کا اجر آخرت میں پائیں گے، اور آخرت میں جس وقت وہ اجر آئے گا، اس وقت ان

کے دل اللہ کا شکر ادا کریں گے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹھے بٹھائے، ان کو بغیر کوئی بڑا ضرر پہنچائے یہ سعادت عطا فرمائی، ان کو اس کا انعام مل رہا ہے، اور آپ یہ بھی یاد رکھیے کہ کلمۂ حق کہنے کے لیے اور صحیح دعوت پہنچانے کے سلسلے میں اور علوم نبویہ اور علوم اسلامیہ اور علوم ربانیہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے سلسلے کی آپ کو آزمائش بھی پیش آسکتی ہے، اور کم سے کم جو آزمائش آئے، وہ ہے فاقہ کشی اور عسرت کی زندگی، کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کلمۂ حق کہیں اور آپ کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے، یہ ہمارے اسلاف کی روایت ہے اور یہ چیز قابل مبارکباد ہے، جس کا اثر ہم سب کے دلوں پر ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا اثر ہے، جیسے ہی اس واقعہ کی اطلاع ملی زبانی اور ایک خط کے ذریعہ، کیا حال رہا ہے، دن کس طرح گزرا، رات کس طرح گزری، اس کو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، میں صاف کہتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ مدارس رہیں گے، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس سے اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، یہ مدارس ہی ہیں جو بچانے والے ہیں۔

ملک ڈوب رہا ہے

یہ ملک ڈوب رہا ہے، اگر کوئی آواز اٹھتی ہے اس کو بچانے اور راستہ دکھانے کے لیے تو ان ہی مدارس سے اٹھتی ہے، اخلاق کی تعلیم کون دیتا ہے؟ انسان کے احترام کی دعوت کون دیتا ہے؟ پیام انسانیت کی تحریک کہاں سے اٹھی؟ اتنا بڑا ملک تھا، ہزاروں کی تعداد میں سنت اور ان کے یہاں کے فقیر تھے، ان کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ یونیورسٹیاں تھیں، کسی کو اتنے بڑے ملک میں توفیق نہیں ہوئی، کہ انسانیت کی تحریک شروع کرتا، اور انسانیت کی آواز بلند کرتا، انسانیت کے پاس ولحاظ، عزت وآبرو کی، انسان کو دیکھ کر خوش ہونے کی، اتنا بڑا ملک تھا، کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی، ہمارے مدارس ہی سے یہ آواز اٹھی، خدا کے بڑے عذاب سے بچانے کے لیے اور جو بڑے زلزلہ اور عظیم وبا کا شکار ہونے نہیں دیتا، وہ سب برکت ہے قرآن شریف کی، حدیث شریف کی، اللہ کا نام لینے اور حافظوں کی۔

مدارس شفاخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں

یہ مدارس تو شفاخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں، دس شفاخانوں سے، مرنا سب کو ہے، ایک مدرسہ پچاس شفاخانوں سے افضل ہے، یہ جو کوتوالیاں ہیں، جرائم سے روکتی ہیں اور مجرمین کو سزا دیتی ہیں، مدارس اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، اس لیے یہ مدرسے اور یہاں سے نکلنے والوں کی تقریریں اور ان کی نصیحتیں اور ان کی کوشش وہ اتنی بڑی تعداد میں مجرمین پیدا ہونے نہیں دیتی جتنی کہ یہاں کی مغریات، ضمیر فروشی پر آمادہ کرنے والی چیزیں ہیں، جن کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، جس ملک میں یہ ہورہا ہے کہ ایک معصوم خاتون جس کو بڑے ارمانوں سے بیاہ کرلائے تھے، اس کو جلا دیا جائے، اور گلا گھونٹ دیا جائے، اس لیے کہ دس ہزار روپے نہیں لائی، کیوں نہیں لائی؟ اسکوٹر کی فرمائش کی اسکوٹر نہیں لائی، قومی آواز میں میں نے پڑھا اور جائزہ لیا گیا کہ ہر بارہ گھنٹے پر دہلی میں ایک دولہن کو جلا دیا جاتا ہے، جس ملک میں ایسی دولت پرستی ہو کہ پیسے کے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے، اس ملک کو اگر کوئی چیز بچانے والی ہے تو یہ مدرسے ہیں، یاد رکھیں ہمارے یہاں کے حکمراں، سیاسی لیڈر، فلسفی اور مصنفین کہ اگر یہ مدرسے نہ رہے اور کوئی اللہ سے ڈرنے والا نہ رہا، انسانیت کی کوئی تعلیم دینے والا نہ رہا، تو یہ ملک بچنے والا نہیں ہے، میں نے دیکھا ہے جو اس طرح کے ملک تھے، ان کے صرف تاریخ میں نام رہ گئے ہیں، سمندروں میں ڈوب گئے، زلزلوں اور وباؤں کے شکار ہوگئے، تو خود ایک دوسرے کو مار مار کر اور لڑلڑ کر مر گئے ہیں، ابھی نسل انسانی بچی ہوئی ہے، قیامت کیوں نہیں آرہی ہے؟ اس لیے کہ ابھی اللہ کا نام زندہ ہے، اللہ کا نام لینے والے زندہ ہیں، انسان کو دیکھ کر خوش ہونے والے زندہ ہیں، اور پیسے کی حقیقت بتانے والے زندہ ہیں، اس ملک کا اصلی معبود پیسہ ہے، یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بچپن سے کس طرح دولت کی پوجا اور تعلیم دی جاتی ہے، اگر عقل ہوتی، سمجھ ہوتی اور انصاف ہوتا تو ان مدرسوں کو سینے سے لگاتے اور ان کی تحریروں کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے کہ یہ مدرسے جو کچھ ہم ان کی خدمت کرسکیں کریں، اور ہم چاہے جس پر ہاتھ اٹھائیں، کسی پر شک

کریں، لیکن ان مدرسوں کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ذہنی افلاس کا اور ہوائے زر پرستی کا اور غلط سیاست کا یہ نتیجہ ہے، یہ مدرسے آنکھوں میں کھٹکنے لگے ہیں، اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ جب تک یہ مدرسے ہیں، کفر و اسلام کا فرق، دینیت و لا دینیت کا فرق، شرک کا فرق، اطاعت و معصیت کا فرق باقی رہے گا، یہ ملک کے حق میں ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے۔

ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں، چاہے دل پر ہاتھ رکھ کر دینی پڑے، آپ کو ایک چھوٹے سے مرحلے سے اللہ نے گزار دیا، آپ کی تحریروں، تقریروں، دوروں سے اس ملک میں انسانیت کی فضا پیدا ہو، تعاون، قدر دانی کی فضا پیدا ہو، ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں اونچا ہو، کم سے کم اسلامی ملکوں میں یہاں سے لے کر ترکی اور مراکش تک چلے جایئے، ہم تو جاتے ہی رہتے ہیں، وہاں ہندوستان کا تعارف علماء کے نام سے، ان کی تصنیفات کے نام سے ہوتا ہے، یہاں حجة الله البالغة لکھی گئی، یہاں وہ لغت لکھی گئی جس کی مثال نہیں ہے، دوسری زبان اور دوسرے ملکوں میں، تیس جلدوں میں قاموس کی شرح لکھی مرتضیٰ زبیدی بلگرامی نے، ان کے لیے ایک انکشاف ہوتا ہے جب بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے تھے۔

میرے بھائیو! آپ اس کو زیادہ اہمیت نہ دیں، حادثہ کا اثر پڑتا ہے، اور پڑے گا، اس کا کوئی مواخذہ نہیں، لیکن آپ کسی طرح کی مایوسی کا شکار نہ ہوں، آپ کو ثابت کرنا ہے کہ یہ ملک ہماری ہی کوششوں سے ہے، اللہ کے نام اور اس کے رسول کے نام اور تعلیم ہی سے اس ملک کو بچایا جا سکتا ہے، اور اس کے علاوہ اس کو کوئی چیز ہلاکت سے بچا نہیں سکتی، ہمارے علماء اور مدارس کے فضلاء نے جنگ آزادی کی تحریک میں سب سے زیادہ قربانی دی، اور سب سے زیادہ پیش پیش رہے، مالٹا اور انڈمان کی جیلوں میں کون رہا؟ کسی ہندو کا نام نہیں ملتا، میں تو ایک مؤرخ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ علمائے صادق پور کو کالا پانی بھیجا گیا، ان کے مکانات ڈھائے گئے، میں خود شاہد ہوں، میں ایک بار پٹنہ گیا، مولانا خلیل (رحمۃ اللہ علیہ) مجھے یحییٰ علی صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ سے ملانے لے گئے، میرا تعارف کرایا کہ سید صاحب کے خاندان کے ہیں، تو وہ اس مجلس میں کہنے لگے کہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ

ڈاکٹر خان کی طرف سے یہ خط آیا ہے کہ لوگوں نے اس تحریک میں جو نقصان اٹھایا اور ان کا جو تلف ہوا، آپ ان کی فہرست دیجیے، حکومت کی طرف سے اس کو ادا کیا جائے گا۔ انھوں نے جواب لکھا کہ کہ جو کچھ اللہ کے لیے چھوڑا تھا، اس کو نہیں لیں گے۔

یہ کوئی ہندوستان میں جو یہ کہے؟ لاکھوں اور کروڑوں کی جائداد ضبط کر لی گئی، تجارت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، لاکھوں اور کروڑوں روپے ہوتے، انھوں نے کہا: نہیں! جو اللہ کے لیے کیا تھا اس کو نہیں لیں گے۔

بس میرے بھائیو! وہ آپ کے اسلاف تھے، آپ ان کے اخلاف ہیں، ہم تشائم سے کام نہیں لیتے، کہ یہ مرحلے بار بار پیش آئیں، نَسْأَلُ اللّٰهَ العافية.

اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہ دیں، بلکہ کہیں کہ یہ سعادت بھی اللہ نے ہمیں عطا فرمائی، یہ تأسف کی اور تاثر کی بات ہے، اللہ کے یہاں اس کا اجر ملے گا، آپ عزیمت کے لیے تیار رہیں، ہمارا دین رخصتوں کا مجموعہ نہیں ہے، اس میں رخصتیں بھی ہیں اور عزائم بھی، آپ کو عزیمت کے ساتھ دین کی نشر و اشاعت کرنے کی فکر کرنی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تعلیم بھی دینی ہے، حب وطن اور ملک کے ساتھ وفاداری کی بھی تعلیم دینی ہے، لیکن سب دینی اور اخلاقی روح کے ساتھ، اللہ سے ثواب کی لالچ میں اور جو کچھ پیش آئے اس کو برداشت کرنے کے ساتھ، اس پر ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم کو ہر قسم کے مکارہ سے محفوظ رکھے، اپنے راستے پر اور اپنے نبی (ﷺ) کے راستے پر قائم رکھے، عزیمت کے راستہ پر اس دین اور تعلیم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ کے راستے اور رسول (ﷺ) کی اتباع اور اولیائے عظام، شہدائے کرام پر رشک کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہر طرح کے خوف سے، گھبرانے سے بچائے۔ آمین!!! (۱)

---

(۱) نومبر ۱۹۹۴ء میں ندوۃ العلماء پر پولیس یورش کے بعد حضرت مولانا رائے بریلی سے لکھنؤ تشریف لائے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں طلبہ، اساتذہ، اسٹاف اور شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں یہ تقریر فرمائی، ماخوذ از "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۴ء)۔

بنگلہ دیش میں اہل علم وفکر کی ذمہ داری

بنگلہ زبان میں مہارت وقیادت

حضرات اہل علم وفکر، مدرسین واساتذہ، طلبائے عزیز!

ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے

آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، جس ملک کو اللہ نے آپ کے لیے انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کو خدا کے یہاں جواب دینا ہوگا، اگر اسلام سے اس کا رشتہ کمزور ہوگیا اور ملک کے اندر خلاف اسلام رجحان پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اور آپ کا گریبان ہوگا، سیاسی لوگوں سے پوچھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے، ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن سب سے پہلے علماء سے سوال ہوگا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ملک میں اسلام کیسے خطرہ میں پڑا؟ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) فرماتے تھے: میرے ہوتے ہوئے دین کمزور ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو تمام جزوی وذیلی اختلافات کو ختم کرکے اس مقصد پر متحد ہونا چاہیے کہ آپ اس ملک کی رہنمائی کریں، آپ اس ملک کے اس طبقہ کو متاثر کریں، اپنے اخلاص سے اور اپنے ایثار سے، جس کے ہاتھ میں زمام اختیار ہے یا آنے والی ہے، جنہوں نے اس کی تیاری کی ہے، جن کے پاس وہ وسائل و اسلحہ ہیں جن کے ذریعہ سے اس زمانہ میں آدمی کو اقتدار حاصل ہوا کرتا ہے، آپ کا یہ فرض ہے کہ اس طبقہ سے روابط پیدا کریں، آپ ان کی زبان میں ان کو سمجھائیں، آپ کے متعلق ان کا یہ تجربہ ہو جائے کہ آپ بے غرض ہیں، آپ ان سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے ہیں، آپ کو وہ

بڑی سے بڑی رشوتیں دینا چاہیں، آپ کو بڑے سے بڑے مواقع دینا چاہیں، آپ کہیں: نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے! آپ دین کی خدمت کریں۔

بنگلہ زبان میں مہارت پیدا کیجیے!

دوسری بات یہ ہے (ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہے، اس لیے میں کہتا ہوں) کہ یہاں کی زبان (بنگلہ زبان) کو آپ اچھوت نہ سمجھیے، بنگلہ زبان کو آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس کے پڑھنے لکھنے میں کوئی ثواب نہیں ہے، یا عربی میں ثواب ہے یا اردو میں ثواب ہے، آپ کو بنگلہ زبان میں مہارت پیدا کرنا چاہیے، بنگلہ زبان میں آپ اچھے لکھنے والے بنیے، آپ ادیب بنیے، مصنف بنیے، مقرر بنیے، آپ کی زبان میں مٹھاس ہو، رس ہو، آپ کی زبان ایسی ہو کہ لوگ غیر مسلم ادیبوں کی تحریر پڑھنے کے بجائے آپ کی تحریریں پڑھیں اور مست ہوں، اور جھومیں، یہ بات لکھنؤ میں رہنے والے کی زبان سے سنیے، دلی کی زبان بولنے والے کی زبان سے سنیے اور عربی پر جان دینے والے کی زبان سے سنیے، اس وقت تک جو عمر گزری ہے، عربی زبان کی خدمت میں اور انشاء اللہ بقیہ عمر بھی گزرے گی، عربی ہماری زبان ہے، ہم عربی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، الحمد للہ! ہم تو ہم ہمارے بعض عزیز بچے بھی ایسے ہیں جو کسی طرح عربوں سے کم نہیں ہیں، وہ شخص آپ سے کہہ رہا ہے جو عربی زبان کا کیڑا ہے، اور اردو زبان جس کے گھر کی زبان ہے، وہ آپ سے کہہ رہا ہے کہ بنگلہ زبان کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیے، ان کے حوالہ نہ کیجیے کہ لکھیں وہ پڑھیں آپ، یاد رکھیے قلم کے ساتھ اثر آتا ہے، لوگوں نے تو یہ کہا کہ کتاب اگر کسی صاحب ایمان کے قلم سے لکھی ہوئی ہے تو ایمان کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ خطوط کے ذریعہ سے بھی توجہ دی جاتی ہے، جب کوئی شیخ توجہ سے خط لکھتا ہے تو اس خط میں تاثیر ہوتی ہے، اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے، اور آج ان مصنفین کی کتابیں موجود ہیں، جو ان کی کتاب پڑھ لے اس کی نمازوں کی کیفیت بدل جاتی ہے، کتاب کا نماز سے کوئی تعلق نہیں، کتاب کسی اور موضوع پر ہے، لیکن جب وہ صاحب لکھ رہے تھے یا بول رہے تھے تو قلب ان کا متوجہ تھا، آج ان کی کتابیں پڑھیے، ان کی

تحریر پڑھیے تو آپ اس کے بعد نماز پڑھیں گے، ذرا بھی آپ کا احساس اور قلب بیدار ہے تو آپ محسوس کریں گے کہ اس کی کیفیت اور ہے، میں نے بارہا اس کو محسوس کیا ہے۔

آپ غیر مسلموں کی کتابیں پڑھیں، ان کے افسانے پڑھیں، ان کی کہانیاں پڑھیں، ان کی تاریخ لکھی ہوئی پڑھیں، اور آپ پر اثر نہ پڑے؟ ضرور پڑے گا، یہ بہت بڑی کم ہمتی کی بات ہے، آپ لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ جو مسلمان ادیب و شاعر گزرے ہیں، ان کو آپ نمایاں کریں، آپ نذر الاسلام کو نمایاں کیجیے، آپ ان کی چیزیں پڑھیے، اور ان کے ترجمے کیجیے، اللہ تعالیٰ صلاحیت دے تو ان کا کلام عربی میں پیش کیجیے، یہاں کئی ادیب گزرے ہیں، مثلاً عبدالغفور نساخ، ان کا نام بچپن میں اردو ادب کی تاریخ میں پڑھا تھا، اور کئی شاعر گزرے ہیں، ان لوگوں کے حالات لکھیے، دنیا کو بتایئے کہ یہاں کیسے کیسے شاعر گزرے ہیں، خدا کے فضل و کرم سے کوئی جوہر، کوئی کمال ایسا نہیں جو آپ کو نہ ملا ہو، ہمارے مدارس میں تو بعض بعض بنگالی طالب علم اتنے ذہین تھے کہ رشک آتا تھا، اور ہمارے یوپی اور بہار کے طالب علم ان کے سامنے مات تھے، عربی سپاس نامے میں سنتا چلا آرہا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اتنی اچھی عربی لکھنے والے یہاں موجود ہیں، کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہویئے گا، خدا نے آپ کو سب جوہر دیے ہیں، مگر اس کا صحیح استعمال نہیں۔

میری بات یاد رکھیے کہ بنگلہ زبان کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیجیے، دو قسموں سے، ایک غیر مسلموں سے، ایک غیر اسلامی سے، دو قسمیں ہیں، ایک غیر مسلم ہے، ایک غیر اسلامی ہے، غیر اسلامی مسلمانوں میں بھی ہوتے ہیں، غیر مسلم غیر مسلموں میں ہوتے ہیں، غیر مسلموں سے، غیر اسلامیوں سے، دونوں سے قیادت اپنے ہاتھ میں لیجیے، اور اس میں ایسا کمال پیدا کیجیے کہ لوگ ان سے مستغنی ہو جائیں، الحمدللہ ہمارے یہاں کے علماء نے اس کی طرف توجہ کی، ادب، تنقید، تاریخ، تصنیف میں ان کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا، ایک مرتبہ انعامی مقابلہ تھا ایک بڑے اردو رسالہ کی طرف سے کہ اردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے، سب سے بڑا انشاء پرداز، انعام ان کو ملا جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ مولانا شبلی نعمانی اردو کے سب سے بڑے انشاء پرداز تھے، جب کوئی بڑا منتخب جلسہ ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ کو،

مولانا عبدالسلام ندویؒ کو، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کو صدارت تفویض کرتے، اردو شاعری کی تاریخ پر دو کتابیں ہیں جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، ایک ''آبِ حیات'' جو مولوی محمد حسین آزاد کی لکھی ہوئی ہے، جو قدیم نصاب پڑھے ہوئے تھے، اور ایک ''گلِ رعنا'' جو ہمارے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی لکھی ہوئی ہے، دارالمصنفین سے چھپی ہے، ہندوستان میں ہم نے اردو زبان کو دوسرے کے قبضہ میں نہیں جانے دیا، اور آج بھی خدا کا شکر ہے کہ کوئی وہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولویوں کو اردو نہیں آتی، مولوی ٹکسالی زبان میں، میٹھی زبان میں، رسیلی زبان میں تقریر نہیں کر سکتے، لکھ نہیں سکتے، کوئی آج بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا، اب بھی ہمارے علماء میں ایسے ایسے بولنے والے موجود ہیں کہ ان کے سامنے وہ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے جن کو بڑے دعوے ہیں، ایسے ہی آپ کو کرنا چاہیے، دیکھیے (پیر دانا تو نہیں کہتا، لیکن ایک جہاں دیدہ تجربہ کار کی یہ بات لکھ لیجیے) آپ بنگالی زبان سے اگر قطع تعلق اور پرہیز کریں گے تو یہ ایک طرح کی معنوی خودکشی ہوگی، زبانوں میں کوئی بیر نہیں ہوتا کہ ایک زبان آئے تو دوسری زبان نہیں آسکتی، یہ بات غلط ثابت ہوچکی ہے، ''ہفت زبان'' کا ایک محاورہ چلا آرہا ہے کہ سات زبانیں آتی ہیں، لیکن ایسے تو خدا کے فضل وکرم سے تین چار زبان جاننے والے تو ہمارے یہاں بھی موجود ہیں، خدا کے فضل وکرم سے ہمارے کچھ نوجوان ایسے ہیں کہ عربی بولنے کو کہہ دیجیے تو عرب سمجھیں گے کہ شاید عرب ہیں، یہ بات غلط ہے کہ ایک نئی زبان اچھی طرح آسکتی ہے یا نہیں، بلکہ بعض اوقات ایک زبان دوسری زبان کو مدد پہنچاتی ہے۔

قیادت کی اہلیت پیدا کیجیے

بھائیو! یہ دو باتیں یاد رکھو، میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری تمہاری ہے، اس ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، ورنہ تمہارے سب مدرسے بیکار ہیں، میں صاف کہتا ہوں میں مدرسہ کا آدمی ہوں، مدرسہ کے تالاب کی مچھلی ہوں، میں کہتا ہوں کہ اسلام اگر خدانخواستہ نہ رہا تو یہ سب مدرسے بیکار ہیں، یہ مدرسے کسی چیز کی دوا

نہیں، پہلا کام ہے اسلام کو باقی رکھنا، اسلام کا رشتہ اس قوم سے جوڑے رکھنا، دوسری بات ہے قیادت کا مقام حاصل کرنا، قیادت کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپ کو بنگلہ پر عبور نہ ہو، میں نے کل کے استقبالیہ جلسہ میں جس میں اسلامک فاؤنڈیشن نے استقبالیہ دیا تھا، کہا کہ مجھے افسوس ہے اور شرم آرہی ہے کہ میں آپ سے بنگلہ میں بات نہیں کرسکتا، میں خوش ہوتا اگر میں آپ کے سامنے بنگلہ میں تقریر کرتا، ہمارے یہاں اسلام میں کوئی زبان غیر نہیں ہے، سب زبانیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور ایک سے ایک زبان بڑھی ہوئی ہے، زبان کے خلاف تعصب بالکل جاہلانہ بات ہے، نہ کوئی زبان پرستش کے قابل ہے، نہ کوئی زبان نفرت کے قابل ہے، اگر مقدس زبان کوئی ہوسکتی ہے تو عربی زبان ہے، باقی سب زبانیں یکساں ہیں، اللہ نے انسانوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا کی اور سیکڑوں برس میں ان زبانوں میں ترقی ہوئی، اور اب وہ ہمارے پاس ترقی یافتہ شکل میں پہنچیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، اور ہمیں اظہار خیال کے لیے ان سے مدد ملتی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان پڑھنے کا حکم دیا جو صرف یہودیوں کی زبان تھی، اگر ہم زبان وادب کی طرف سے بے اعتنائی برتیں گے تو غیر اسلامی عناصر ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرلیں گے، اور اس سے بڑا نقصان پہنچے گا، کلکتہ سے کتابیں آتی ہیں، مسموم کمیونزم کی پرچار کرنے والی، قومی ولسانی تعصب کی پرچار کرنے والی، ہندو میتھالوجی کی پرچار کرنے والی، اور بڑے شوق سے ہمارے نوجوان پڑھتے ہیں۔

اصل مسئلہ ارتداد کا مقابلہ ہے

بھائی! اگر آپ کو ترمذی کی شرح لکھنی ہو اور مشکوۃ کی شرح لکھنی ہو اور کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرنا ہو، اس کو آپ اردو میں لکھیے یا عربی میں لکھیے، اگر آپ کو عوام سے باتیں کرنی ہوں تو عوام کی سطح پر بات کیجیے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہندوستان پاکستان میں بہت کام ہوچکا ہے، کتب حدیث کی شرحیں لکھی جاچکی ہیں، مذہب حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا جاچکا ہے، اب اس کے لیے کسی نئی بڑی کوشش کی ضرورت نہیں ہے، حضرت مولانا انور شاہ

صاحبؒ اور حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ یہ سب کام کر چکے ہیں، انہوں نے ثابت کر دیا کہ یہ دعویٰ کہ حنفی حدیث کے خلاف کہتے ہیں، غلط ہے، اور ان سے پہلے طحاویؒ نے ''معانی الآثار'' میں، زیلعیؒ نے احادیث ہدایہ کی تخریج ''نصب الرایہ'' میں اور دوسرے حضرات نے بھی یہ کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے، اب نیا میدان ہے جس کی طرف آپ کو توجہ کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ عوام آپ کے اثر سے نکلنے نہ پائیں، وہ آپ کو یہ نہ سمجھیں کہ آپ اس ملک میں رہ کر کے بھی غیر ملکی ہیں، اس ملک میں رہ کر کے آپ پردیسی ہیں، آپ کو تو اس ملک کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا چاہیے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

''إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، .... فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.''(۱)

''اے مسلمانو! تمہارا خون، تمہارے مال، تمہاری عزت وآبرو ایک دوسرے پر حرام ہے، جیسے آج کا (عرفہ کا) دن اس شہر (مکہ) کے جوار میں اس مہینہ (ذی الحجہ) میں جو حرمت کا مہینہ ہے''۔

مسلمان کو تکلیف دینا حرام اور اس کا خون بہانا ظلم عظیم ہے

زبان کے لیے کسی مسلمان کی توہین کرنا، مسلمان کے دل کو دکھانا، مسلمان کا خون بہانا ناجائز اور ظلم عظیم ہے، نہ زبان پرستش کے قابل ہے نہ نفرت کے قابل ﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ [سورۃ الطلاق:۳] ،اللہ نے ہر چیز کا ایک پیمانہ بنایا ہے، اس کا بھی ایک پیمانہ ہے، محبت کرو، کمال پیدا کرو، زبان وشاعری کا لطف لو، اس کا ذائقہ لو، لیکن غلو نہ کرو، خدا کی کتاب کو بھی اگر کوئی پوجنے لگے تو مشرک وکافر ہو جائے گا، اگر قرآن کو کوئی سامنے رکھ کر (اس کو مسجود سمجھ کر) سجدہ کرے تو مشرک ہوگا، عبادت صرف خدا کی ہے، لیکن سب زبانوں سے محبت کرنا اور اس میں عبور حاصل کرنا اور سب کا حق دینا معقول ہے۔

(۱) جزء من حديث أخرجه البخاري في كتاب الحج، باب الخطبة أيام منى، حديث رقم: ۱۷۳۹

میرے عزیزو! اگر یہ باتیں ہماری یاد رہیں تو انشاء اللہ کسی دن یاد کرو گے کہ کوئی کیا کہہ گیا تھا: ﴿فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْٓ إِلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ [سورة غافر: ٤٤]

''جو بات میں تم سے کہتا ہوں، تم اسے آگے چل کر یاد کرو گے، اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک خدا بندوں کو دیکھنے والا ہے۔''

فرشتے بھی سن لیں اور کراماً کاتبین بھی سن لیں کہ ہم حجت پوری کر رہے ہیں اس ملک کے رہنے والے مسلمانوں پر، کہ اگر تمہیں اس ملک میں رہنا ہے، اسلام کو باقی رکھنا ہے تو یہ راستہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔ (۱)

(۱) جامعہ امدادیہ، کشور گنج (بنگلہ دیش) میں ۱۴؍مارچ ۱۹۸۴ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از ''تحفۂ مشرق'' صفحہ ۳۴ تا ۴۲۔

قوم میں علماء کا منصب و مقام

اور

عوام میں ان کے بے اثر ہونے کے اسباب

گفتگو کا دائرہ بہت وسیع ہے، اگر ہم عالم اسلامی کے تمام طبقوں اور حلقوں کا جائزہ لیں گے، اور اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہونے میں ان کی کوتاہی اور پہلو تہی پر گفتگو کریں گے، تو کچھ حاصل نہ ہوگا، اور کسی نتیجہ تک رسائی مشکل ہوگی

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اس لیے ہم اپنی گفتگو کو علماء کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں تک محدود رکھیں گے، یہ گفتگو مفید بھی ہے، اور عملی بھی، اس لیے کہ اس وقت بھی حضرات علماء ہی تشریف رکھتے ہیں، اور ہمارا روئے سخن انھیں کی طرف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اصلاح اور درستگی کا دارومدار علماء کی اصلاح و درستگی پر ہے، علماء اگر صحیح راستہ پر ہوں گے تو قوم بھی صحیح راستہ پر ہوگی، اور اگر علماء میں انحراف ہوگا، بے یقینی اور کمزوری ہوگی، اگر ان کے اندر مادی خواہشات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور حالات کے سامنے جھکنے کا رجحان ہوگا، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا، ان کے اندر سادگی اور قناعت کا فقدان ہوگا، وہ تنعم پسندی اور راحت طلبی کے عادی ہوں گے، تو اس کا اثر لازمی طور پر مسلم عوام پر بھی پڑے گا، اسی موقع کے لیے کسی شاعر نے کہا تھا ۔

مژدہ باد اے مرگ!
عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی، پہلے اسلامی معاشرہ علماء کا ادب کرتا تھا، اور ان کو بڑے احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جب وہ زہد وقناعت، بے نیازی وبلند نفسی اور کسی قدر تقشف وسادگی سے مالا مال تھے، یہاں تک کہ سلاطین وامراء ان سے ڈرتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، اور ان کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے۔

لیکن آج علماء کا یہ حال ہے کہ وہ بھی راحت طلبی کی دوڑ میں سب کے ساتھ مصروف ہیں، اور اب ان کے درمیان اور ان کے ہم وطن وہم نسل افراد کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، اس لیے معاشرہ بھی انھیں اسی نگاہ سے دیکھنے لگا جس نگاہ سے وہ عوام کو دیکھتا ہے، اور اب لوگوں کے دلوں میں علماء کی کسی نصیحت یا تنقید کی وقعت نہیں پیدا ہوتی۔

دعوت وتبلیغ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ علماء اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کریں، اپنا اعتبار اور اپنی دینی اور اجتماعی قیمت کا شعور پیدا کریں، اصلاح وتجدید کی تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی اسلام اور مسلمان کسی زبردست بحران سے دوچار ہوئے ہیں، ہر طرف ناامیدی اور بے یقینی کے بادل چھا گئے ہیں، ایک عالم نمودار ہوا، اصلاح وجہاد کے میدان میں آیا، حالات کو چیلنج کیا اور تاریخ وواقعات کا رخ موڑ کر رکھ دیا، اسلامی عقائد کی سلامتی اور اسلامی شریعت کی عظمت کے تحفظ کا فرض انجام دیا، قوم کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے ایک نئی زندگی بخش دی، یہ عمل ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں، امام حسن بصریؒ سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک، ابن تیمیہ حرانیؒ تک، شیخ احمد سرہندیؒ اور اس صدی کے علمائے ربانیین اور ائمۂ مصلحین تک ہر زمانہ اور ہر صدی میں یہ ہوتا آیا ہے، اور قیامت تک اس دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتذکیر کے سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔(۱)

---

(۱) لبنان کے شہر صیدا میں کی گئی اہم تقریر کا خلاصہ، ماخوذ از "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"، ص: ۱۴۳-۱۴۵۔